For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

قدرت اللہ شہاب

۱۹۹۸ء

- اقبالِ جرم

قدرت اللہ شہاب

۹ جون ۱۹۳۸ء سے میں نے باقاعدہ ایک ڈائری رکھنے کی طرح ڈالی۔ یہ روایتی روزنامچہ کی صورت میں نہ تھی بلکہ میں نے اپنے ایک خود ساختہ شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) میں ہر اس واقعہ یا احوال کو نوٹ کرنا شروع کر دیا جو میرے نزدیک کسی خاص اثر یا اہمیت کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ یہ میری عادت ثانیہ بن گئی۔

ایک روز میں نے اپنے ان کاغذات کا پلندہ ابن انشاء کو دکھایا' تو وہ بہت ہنسا۔ میری مختصر نویسی میں درج کی ہوئی کوئی بات تو اس کے پلے نہ پڑی لیکن یہ ضرور پوچھا کہ ۹ جون کی تاریخ سے یہ ڈائری شروع کرنے میں کیا راز ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ البتہ جو صاحب اس کتاب کا آخری باب "چھوٹا منہ بڑی بات" پڑھنے کا بوجھ برداشت کر لیں گے' ان پر اس تاریخ کی حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی۔

کچھ عرصہ بعد ابن انشاء ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر علاج کی غرض سے لندن چلا گیا۔ اس کی وفات سے دو ڈھائی ماہ قبل میں اسے ملنے لندن گیا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ایک روز اچانک ابن انشاء نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا کہ اگر کسی ترکیب سے اسے دوبارہ دنیاوی زندگی مل جائے تو اسے وہ کس طرح گزارنا چاہے گا۔ اس کی تشنہ تکمیل تمناؤں' آرزوؤں اور امنگوں کی تفصیل اتنی طویل تھی کہ اسے سناتے آدھی رات بیت گئی۔ اس کے

For more books visit www.4Urdu.com

بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی نصیب ہو تو اسے کس طرح بسر کرنا چاہو گے؟

میں نے مختصراً جواب دیا کہ بہت سی کج فہمیوں' کمزوریوں' خطا کاریوں اور غفلتوں کی اصلاح کر کے میں دوسری زندگی بھی مجموعی طور پر ویسے ہی گزارنا چاہوں گا جیسے کہ موجودہ زندگی گزار رہا ہوں۔

یہ سن کر ابن انشاء چوکنا ہو گیا اور کاغذ پنسل ہاتھ میں لے کر سکول ماسٹر کی طرح حکم دیا۔ "وجوہات بیان کرو' تفصیل سے۔"

میں خود احتسابی کی کدال سے اپنا اندر اور باہر کرید کرید کر بولتا رہا اور ابن انشاء ایس ایچ او کی طرح ایف آئی آر کے طور پر میرا بیان لکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست یہ تھی۔

دین کے بارے میں میں کبھی شک و شبہ یا تذبذب میں گرفتار نہیں ہوا۔ دین کے متعلق میرا علم محدود اور عمل محدود تر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی بے نیازی سے مجھے اسلام کی بعض جھلکیوں کی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔

ایک دور افتادہ' پس ماندہ اور سادہ ماحول سے نکل کر میں نے اپنے زمانے کی سب سے بڑی سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں حصہ لیا اور اللہ نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔

سروس کے دوران میں نے کبھی اپنی پوسٹنگ یا ٹرانسفر کے لیے کسی قسم کی کوشش' سفارش یا خوشامد سے کام نہیں لیا۔ اس کے باوجود مجھے اچھے سے اچھا عہدہ نصیب ہوتا رہا۔

ملازمت کے دوران میں نے دانستہ طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی جائز تنخواہ کے علاوہ میں نے کبھی کسی حکومت سے مالی یا زرعی اراضی یا پلاٹ وغیرہ کی شکل میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک بار سربراہ مملکت نے مجھے آٹھ مربع زمین کا انعام دینے کی پیشکش کی۔ جب میں نے اسے قبول نہ کیا تو انہوں نے کسی قدر ناراضگی سے اس کی وجہ

For more books visit www.4Urdu.com

پوچھی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ انسان کو انجام کار دو ڈھائی گز زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس کو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے۔

URDU4U.COM

ملازمت کے دوران میں نے اپنا کام ایمانداری اور بے خوفی سے کیا۔ اس کی پاداش میں چار بار استعفیٰ دینے کی نوبت آئی۔ چوتھی بار بعد از خرابی بسیار منظور تو ہو گیا لیکن میری پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ غالباً سزا کے طور پر تین برس تک رکے رہے۔ مجھے یہ تسلی ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسی عظیم ہستی کے ساتھ میری بس یہی ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی پنشن کے حصول میں یکساں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تین برس خاصی تنگدستی کا زمانہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی انسان کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

میں خود کسی کا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یقینی ہے' دوسری تخمینی۔ دوسروں کے دل کا احوال تو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔

انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات میں وقتہ فوقتہ رنجشیں' کدورتیں' نفرتیں اور تنازعے پیدا ہونا ایک فطری امر ہے' میں ان کمزوریوں سے ہرگز مبرا نہیں۔ لیکن میں نے رنجشوں' کدورتوں اور تنازعوں کو ہمیشہ عارضی اور دوستیوں اور محبتوں کو ہمیشہ دائمی سمجھا ہے۔

میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے وہی بات کہی جائے جو اس کے منہ پر دہرائی جا سکے۔ اس اصول کو پوری طرح نبھا تو نہیں سکا' لیکن کسی حد تک اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی رہی ہے۔

میں نے اپنے خلاف تنقید یا الزام تراشی کا برداشت کرنا سیکھا ہے اور اس کے جواب میں تضحیک یا تردید کرنے سے گریز کیا ہے۔ البتہ بجا یا بے جا تعریف سن کر دل خوش ہو جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بندہ کے لیے مدح و ذم دونوں یکساں ہیں۔

میں کبھی Frustrate (مایوس) یا بور نہیں ہوا۔

For more books visit www.4Urdu.com

تنہائی کے احساس نے مجھے نہیں ستایا۔ میں اکیلے میں زیادہ خوش رہتا ہوں۔
خوش قسمتی سے مجھے ایسے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی' جن کا اپنا اپنا رنگ اور اپنی
URDU4U.COM
اپنی شخصیت ہے۔ مثلاً ابن انشاء' ممتاز مفتی' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' واصف علی واصف
صاحب' جمیل الدین عالی' ریاض انور' ایثار راعی' مسعود کھدر پوش' ابن الحسن برنی' اعجاز
بٹالوی' ایوب بخش اعوان وغیرہ۔ یہ سب اپنے اپنے میدان کے منفرد شہسوار ہیں۔ باہمی
محبت' خلوص' احترام اور اعتماد کے علاوہ ہمارے درمیان اور کوئی خاص قدر مشترک یا مقصدیت
نہیں۔ اس کے باوجود ہر زمانے میں ہمارے تعلقات میں نہ کوی کجی آئی ہے اور نہ
کوئی کمی پیدا ہوئی ہے۔
خاص طور پر ممتاز مفتی انتہائی ذکی الحس' ضدی' بے باک اور شدت اور حدت پسند تخلیق
کار ہیں۔ کسی وجہ سے میری کوئی حرکت انہیں پسند آ گی اور انہوں نے بیٹھے بٹھاے
ایسی عقیدت کا روگ پال لیا کہ میرے چہرے پر مشک کافور سے مہکتی ہوئی حنائی داڑھی
چسپاں کر کے' میرے سر پر دستار فضیلت باندھی اور سبز پوشوں کا پر اسرار جامہ پہنا
کر اپنی سدا بہار تحریروں کے دوش پر مجھے ایسی مسند پر لا بٹھایا' جس کا میں اہل تھا نہ
خواہش مند۔ اس عمل سے ان کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ میرے لیے وہ ایک طرح
کے مرشد کا کام دے گئے۔ ان کی وجہ سے میں صراط مستقیم پر ثابت رہنے پر اور
بھی زیادہ مستعد ہو گیا تا کہ ممتاز مفتی کی عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ بظاہر
میرا نفس تو بہت پھولا' لیکن اندر ہی اندر عرق ندامت میں غوطے کھاتا رہا۔ کیونکہ من
آنم کہ من دانم
میں نے دنیا بھر کے درجنوں سربراہان مملکت' وزرائے اعظم اور بادشاہوں کو کئی کئی مرتبہ
کافی قریب سے دیکھا ہے لیکن میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا اور نہ ہی کسی میں مجھے
اس عظمت کا نشان نظر آیا جو جھنگ شہر میں شہید روڈ کے فٹ پاتھ پر پھٹے پرانے جوتے
گانٹھنے والے موچی میں دکھائی دیا تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس طرح کی زندگی کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟ اب تو بس یہی جی چاہتا ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

URDU4U.COM

ابن انشاء نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ فہرست میرے حوالے کی' اور وصیت کی کہ اپنی ڈائری کی خفیہ نویسی کو بے نقاب کرو اور دلجمعی سے ایک کتاب لکھو۔ میں تو اسے پڑھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا لیکن میری روح خوش ہو گی۔
حامی تو میں نے بھر لی' لیکن جب قلم اٹھایا تو ایک شدید الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے زندگی بھر کوئی ایسا تیر نہیں مارا جس پر شیخیا ں بگھار کر

اور اپنے منہ میاں مٹھو بن کر ادب کے میدان میں ایک برخود غلط تیس مار خاں بننے کی کوشش کروں ------- کیا لکھوں؟ -------- کیسے لکھوں؟ -------- اور کیوں لکھوں؟ -------- اسی شش و پنج میں کئی برس گزر گئے۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ کی تاریک سرنگ میں روشنی کے کچھ آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ جن واقعات' مشاہدات اور تجربات نے مجھے متاثر کیا ہے ان کی روئیداد بے کم و کاست بیان کر دوں۔
اس کے علاوہ یہ امر بھی مد نظر رہا کہ بعض غلط فہمیوں اور مفروضوں کی بنا پر میرے ماتھے پر کچھ کلنک کے ٹیکے لگ چکے ہیں' جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً میرے محترم اور مہربان بزرگ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے کسی شاعرانہ موڈ میں یہ کہہ دیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

جب کہیں انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

اس شعر کا بہت چرچا ہوا اور یہ تاثر دیا گیا کہ وطن عزیز میں "انقلاب" کی آڑ میں جتنی غیر جمہوری کارروائیاں ہوتی رہی ہیں ان سب میں میرا کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جب گورنر جنرل غلام محمد نے سب سے پہلے اسمبلیاں توڑ کر آمریت کا ڈول ڈالا' اس وقت میں پنجاب کی صوبائی حکومت کے ماتحت لاہور میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر متعین تھا۔ اس واقعہ کے سات آٹھ روز بعد مجھے اچانک گورنر جنرل کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ اس وقت تک ملک غلام محمد سے میری نہ کوئی ذاتی شناسائی تھی نہ کوئی رابطہ تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہوا۔ اس وقت ۲۰ ستمبر سے میں جناح ہسپتال کراچی میں عارضہ قلب کے علاج کے لیے داخل تھا۔ اکتوبر کے شروع میں ہسپتال سے گھر آ گیا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ مزید دو ہفتے دفتر نہ جاؤں اور گھر پر ہی مکمل آرام کروں۔ مارشل لاء لگنے کی خبر مجھے پہلی بار کرنل مجید ملک نے رات کے بارہ بجے گھر پر ٹیلیفون کر کے سنائی۔ وہ ان دنوں مرکز میں پرنسپل انفارمیشن آفیسر تھے۔ دوسرے مارشل لاء کی سازش جنرل محمد یحییٰ اور ان کے ایک مخصوص ٹولے تک محدود تھی۔ پورے دس روز میں اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ میں بے کار بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ چند دنوں بعد اس دھاندلی پر ہلکا سا احتجاج کر کے میں بیوی بچے سمیت بیرون ملک چلا گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ تیسرے مارشل لاء کے وقت میں اسلام آباد میں گوشہ نشینی کی زندگی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اقتدار میں آنے کے پینتیس روز بعد مجھے اچانک جنرل محمد ضیاء الحق کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ملا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ تراویح کے بعد رات کے تقریباً بارہ بجے میں آرمی ہاؤس پہنچا۔ اس وقت جنرل صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں مولانا ظفر الحق انصاری کے ساتھ مصروف

For more books visit www.4Urdu.com

گفتگو تھے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جنرل صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا۔ "ملک کے اس نازک مرحلے میں ہمیں تجربہ کار کارکنوں کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ کل سے تم وزارت تعلیم کا کام سنبھال لو۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا۔ "جناب! اب مجھ میں کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ کچھ تو ضعیف العمری کا تقاضا ہے' کچھ ریٹائرڈ زندگی نے آرام پسندی کی عادت بڑھا دی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ عرصہ کے لیے لندن جا کر اپنے دوست ابن انشاء کی عیادت کرنا چاہتا ہوں۔"

جنرل صاحب مسکراتے رہے اور فرمایا۔ "کوئی بات نہیں' ضرور جاؤ۔ وزارت تعلیم کے سیکرٹری ڈاکٹر محمد اجمل چند روز میں یونیسکو کی کسی تعلیمی کانفرنس کے لیے جنیوا جا رہے ہیں' میں تمہیں ان کے ساتھ ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے لندن بھی ہو آنا۔ واپسی پر پھر بات ہو گی۔"

میں نے اس وقفہ کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر اجمل کے ساتھ پہلے جنیوا اور پھر لندن چلا گیا۔ ہم کچھ روز ابن انشاء کے ہاں ٹھہر کر واپس اسلام آباد آ گئے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میری ٹال مٹول پہچان کر اب وزارت تعلیم میں کام کرنے کی بات آئی گئی ہو گی۔ لیکن میرے کئی عزیزوں اور دوستوں نے جو فوج میں ملازم تھے' مطلع کیا کہ جی ایچ کیو کے افسروں کی ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے میرا نام لے کر بتایا کہ انہوں نے شعبہ تعلیم کے لیے مجھے منتخب کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ کویت سے میرے ایک دیرینہ دوست کا مبارکباد کا خط آیا کہ مشرق وسطیٰ کے دورے پر کسی مقام پر پاکستانیوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے جنرل صاحب نے پھر یہی بات دہرائی۔ مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی لیکن میں خاموشی سے کان لپیٹ کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اس دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے دوسرے نورتن مل گئے تھے۔ میں ان کا تہہ دل سے

For more books visit www.4Urdu.com

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اگر خدا نخواستہ میں لالچ میں آ کر یہ پیشکش قبول کر لیتا تو مجھے یقین ہے کہ نوے روز کے مارشل لاء کو ساڑھے آٹھ سال (یا گیارہ سال) تک طول دینے کا سہرا بھی اسی خاکسار کے سر باندھا جاتا۔

URDU4U.COM

صدر ایوب کے زمانے میں جب انہوں نے جگہ جگہ عام جلسوں میں سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تو میرے دوست سید محمد جعفری نے اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں یہ پھبتی اڑائی۔

یہ سوال و جواب کیا کہنا
صدر عالی جناب کیا کہنا
کیا سکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا

سید محمد جعفری بڑے بلند پایہ اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کے نام کی وجہ سے یہ اشعار بہت سے حلقوں میں زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ اس شہرت نے یہ ظلم ڈھایا کہ ہر کوئی سمجھنے لگا کہ صدر ایوب میرے اشارے پر ناچتے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ میرے مشوروں کا مرہون منت ہے۔

چنانچہ رائٹرز گلڈ قائم ہوا تو کچھ نے یہی سمجھا کہ میں نے ترپ چال چل کر ادیبوں اور دانشوروں کے تمام انڈے صدر ایوب کی جھولی میں ڈال دیئے ہیں۔ سرکاری درباری حلقوں کو ضد تھی کہ صدر ایوب کے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر یہ ادارہ "سرخوں" کی کمین گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جب "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" اور "لیل و نہار" پر حکومت نے زبردستی اپنا قبضہ جمایا' اسے بھی میرے ذہن رسا کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء کے بدنام زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کا نفاذ بھی میرے ہی کھاتے

For more books visit www.4Urdu.com

میں ڈالا گیا۔ علی ہذا القیاس-------

مجھے توقع تھی کہ صحافی برادری جو بڑے بڑے "سکوپ" لے اڑنے میں مہارت رکھتی ہے' ان میں کوئی صاحب دل میرے سر تھوپے ہوئے الزامات کی تحقیق اور تفتیش کرنے کی زحمت بھی اٹھائے گا۔ یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ الٹا بھیڑ چال کی صورت میں بہت سے حضرات بلا چوں و چراں یہی الزامات دہراتے رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کتاب لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کا مقصد اپنی بری اور معصومیت کا ڈھول پیٹ کر نمبر بڑھانا نہیں۔ فقط حقائق کے ریکارڈ کو صاف کرنا مقصود ہے۔

اس کتاب میں واقعات سب صحیح ہیں' لیکن اسلوب بیان میرا ہے۔ جہاں کہیں میں نے کوئی نتائج اخذ کئے ہیں یا کوئی رائے دی ہے ان کا ذمہ دار بھی میں ہی ہوں۔ ان سے بعض کو اتفاق ہو سکتا ہے بعض کو اختلاف۔ دونوں صورتیں میرے لیے برابر ہیں۔ اپنی کج فہمیوں یا خام خیالیوں کی اصلاح کرنے میں میری انا کوئی رکاوٹ نہ بنے گی بلکہ خوشدلی سے اظہار تشکر میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔

کچھ صاحبان کو گلہ ہے کہ جو واقعات چٹخارے لے لے کر میں اب سنا رہا ہوں' اس وقت کیوں خاموش رہا جب یہ سب کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ میں ایک مثالی بیورو کریٹ تو نہیں لیکن قدرے اچھا بیورو کریٹ ضرور رہا ہوں۔ اچھا بیورو کریٹ بننے کے لیے چند اصولی شرائط لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی معاملے میں اس کا مشورہ طلب کیا جائے تو اس پر اپنی بے لاگ رائے کا بے خوفی سے اظہار کرے۔ اگر اس کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو گیا تو فبہا -------- بصورت دیگر اگر اس کی رائے یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ایک اچھے بیوروکریٹ کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں کہ ایک یہ کہ فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا مخالف' اس کا فرض ہے کہ وہ سر تسلیم خم کر کے اس پر دیانتداری سے عملدرآمد کرے۔ بصورت دیگر استعفیٰ دینے پر ہمت چست کرے اور ملازمت چھوڑ کر جو جی چاہے کہے سنے۔ اپنی سروس کے دوران میں ان دونوں راستوں پر چلا ہوں۔ پہلے پر زیادہ' دوسرے پر کم۔ میرے کمزور ضمیر نے مجھے فقط چار

For more books visit www.4Urdu.com

بار استعفیٰ پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ چوتھی بار جب میرا استعفیٰ منظور ہوا' اس وقت میری ملازمت کے سات آٹھ برس باقی تھے۔ میں اسے اپنا کمال تو نہیں سمجھتا جس پر اتراتا پھروں' لیکن مطمئن ضرور ہوں۔

URDU4U.COM

ریٹائرمنٹ کے بعد ہر سرکاری ملازم کو حق حاصل ہے کہ وطن کے دفاع اور سالمیت کے State Secrets (امور ریاست کے راز) فاش کئے بغیر وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو آزادی کے ساتھ بیان کرے۔ میں نے اسی موقف کو اپنا کر یہ کتاب لکھی ہے۔ دنیا بھر میں بھی یہی چلن رائج ہے۔

اس میں کئی اہم واقعات تشنہ اظہار رہ گئے ہیں۔ مثلاً بنگلہ دیش کے قیام کا پس منظر' عوامل اور عواقب یا ذوالفقار علی بھٹو کے پانچ سالہ دور حکومت اور جنرل محمد ضیاء الحق کے ساڑھے آٹھ برس کا مارشل لاء ------- یہ موضوعات اتنے اہم اور دور رس ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر پوری پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان ادوار میں میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ کسی حکومت یا حکمران کے بارے میں اندرون خانہ کی باتیں معلوم کر سکیں۔ اگرچہ میں نے "حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ" پڑھی ہوئی ہے' لیکن کسی وجہ سے حکومت نے آج تک اسے ایک انتہائی خفیہ راز کے طور پر چھپا رکھا ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں کوئی بات لکھنا ایک سول سرونٹ کے ضابطہ کردار کے منافی ہو گا۔ میں نے زندگی بھر کبھی اس ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے ان موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ کسی وقت کوئی اہل دل ان ادوار کے احوالات کو قلمبند کرنے کا حق ضرور ادا کرے گا۔

اس کتاب کا مقصد کسی فرد کی جان بوجھ کر کردار کشی' بت شکنی یا بت تراشی کرنا نہیں ہے۔ جو لوگ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں' ان کی ذات انفرادی نہیں رہتی' بلکہ اپنی طرز کا ایک ادارہ بن جاتی ہے۔ تاریخ کی سرچ لائٹ نہایت تیز اور بے رحم ہوتی ہے۔ اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خد و خال سامنے آ جاتے

For more books visit www.4Urdu.com

ہیں۔ ان خد و خال کی لطافت یا کثافت کا ذمہ دار مصنف ہے' نہ اس کی تصنیف۔ یہ تو محض ان افراد کے ذاتی' صفاتی' ظاہری یا باطنی کردار کا عکس ہے جو اپنے اپنے زمانے میں زندگی کے اسٹیج پر اچھا یا برا پارٹ ادا کرنے کے بعد زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ دونوں صورتوں میں میں کسی معذرت کا طلبگار نہیں۔ میں نے حقائق کو انتہائی احتیاط سے ممکنہ حد تک اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے' جس رنگ میں وہ مجھے نظر آئے ہیں۔ ہر طرح کی احتیاط کے باوجود انسان خطا کا پتلا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت دونوں دھندلا سکتے ہیں۔ اس لیے میں حتمی طور پر اپنی پارسائی یا معصومیت کا دعویٰ کرنے سے بھی معذور ہوں اور اللہ تعالیٰ کی شان توابی' ستاری' غفاری اور بے نیازی کا سہارا لے کر ان تمام جرائم کا اقرار کرتا ہوں' جن کا مجھے علم ہے اور جن کا مجھے علم نہیں۔

محترمہ ادا جعفری نے اسلام آباد میں ایک گھریلو قسم کی ادبی تنظیم "سلسلہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ انہوں نے مجھ پر ایسا دباؤ ڈالا کہ مجھے اس تنظیم کے ماہانہ اجلاس میں "شہاب نامہ" کا ایک باب سنانا پڑتا تھا۔ جب وہ کراچی چلی گئیں' تو محترمہ نثار عزیز بٹ نے بھی یہی سلسلہ جاری رکھا۔ اس کتاب کے ابتدائی چند باب انہی محفلوں کے لیے لکھے گئے۔ اس سے میرا ست رفتار قلم کسی قدر تیزی سے رواں ہو گیا۔ "سلسلہ" بند ہونے کے بعد جواں سال ادیبوں کی ایک ایسی ہی تنظیم "رابطہ" نے بھی میری اسی طرح مدد کی۔

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد نے مجھے اپنی چند نشستوں میں اس کتاب کے کچھ باب سنانے کی دعوت دی۔ ان نشستوں میں پرانی اور نئی نسل کے ہونہار ادیبوں کی تنقید اور تعریف اور بحث مباحثہ نے میری رہنمائی کی اور اس طرح مجھے اپنی تحریر میں بہت سی اصلاحیں کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

نیپا (NIPA) کراچی اور پشاور میں بھی مجھے کچھ باب سنانے کا موقع ملا۔ ان اداروں میں تربیت پانے والے سینئر سرکاری افسران کا رد عمل میرے بہت کام آیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

سیارہ ڈائجسٹ' معاصر' دستاویز' نیا دور اور تخلیقی ادب جیسے رسالوں میں میرے کچھ باب شائع ہوئے۔ انہیں پڑھ کر بہت سے قارئین نے اپنے خطوں سے میری بڑی ہمت بڑھائی۔ ان میں کچھ خطوط ایسے قد آور ادیبوں کی جانب سے بھی تھے جن کی قدر افزائی میرے لیے باعث افتخار ہے۔

اس کتاب کا پورا مسودہ ممتاز مفتی' بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے حرف بہ حرف پڑھ کر اپنی مثبت تجاویز سے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی ہے۔

ان سب اداروں' رسائل اور احباب کا لفظی شکریہ ادا کر کے میں ایک فرسودہ رسم دہرانا نہیں چاہتا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں ان سب کا کس قدر ممنون احسان ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش اور خوشحال رکھے۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

کہنے لگے۔ "پلیگ کا چوہا' پلیگ کا چوہا' گھر جا کر جلدی نہایو' ورنہ گلٹی نکل آئے گی۔"

ان لوگوں نے بھی پلیگ کی جملہ علامات پر حسب توفیق روشنی ڈالی اور میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

URDU4U.COM

ان دنوں جموں شہر میں ہر روز دس دس پندرہ پندرہ لوگ طاؤن سے مرتے تھے۔ گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ گاہک دکانوں کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دکاندار گاہکوں کو شک و شبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے ہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اور ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ سڑک پر راہگیر ایک دوسرے سے دامن بچا بچا کر چلتے تھے۔ شہر کا ہر مکان دوسروں سے کٹ کٹا کر الگ تھلگ ایک قلعہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں پھٹی پھٹی سہمی سہمی آنکھوں والے محصور لوگ چپ چاپ اپنی اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ میونسپل کمیٹی والے در و دیوار سونگھ سونگھ کر پلیگ کے مریضوں کا سراغ لگاتے تھے۔ جہاں ان کا چھاپہ کامیاب رہتا تھا' وہاں وہ علی بابا چالیس چور کی مرجینا کی طرح دروازے پر سفید چونے کا نشان لگا دیتے تھے۔ تھوڑی بہت رشوت دے کر یہ نشان اپنے مکان سے مٹوایا اور اغیار کے دروازوں پر لگوایا بھی جا سکتا تھا۔ پلیگ کے عذاب میں مبتلا ہو کر مریض تو اکثر موت کی سزا پاتا تھا' باقی گھر والے مفرور مجرموں کی طرح منہ چھپائے پھرتے تھے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ ملانے کا رواج بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ لوگ دور ہی دور سے سلام دعا کر کے رسم مروت پوری کر لیتے تھے۔

یکے بعد دیگرے دو طاؤن زدہ چوہوں کو ہاتھ لگانے کے باوجود جب میرے تن بدن میں کوئی گلٹی نمودار نہ ہوئی تو میرا دل شیر ہو گیا۔ اپنے ارد گرد سہمے ہوئے' ہراساں چہرے دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔ اور ان کی بے بسی سے شہ پا کر رفتہ رفتہ میرے دل میں خوف کی جگہ نئے نئے منصوبے سر اٹھانے لگے۔

For more books visit www.4Urdu.com

• جموں میں پلیگ

گرمیوں کا موسم تھا اور جموں شہر میں طاؤن کی وبا بڑی شدت سے پھوٹی ہوئی تھی۔ اکبر اسلامیہ ہائی سکول میں چوتھی جماعت کے کلاس روم کی صفائی کا کام میرے ذمہ تھا۔ ایک روز چھٹی کے بعد جب میں اکیلا کمرے کی صفائی کر رہا تھا' تو ایک ڈیسک کے نیچے ایک چوہا مرا پڑا ملا۔ میں نے اسے دم سے پکڑ کر اٹھایا' باہر لا کر اسے زور سے ہوا میں گھمایا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر لال دین زور سے پھنکارا' اور اپنی لنگڑی ٹانگ گھسیٹتا ہوا دور کھڑا ہو کر زور زور سے چلانے لگا۔ لال دین ہمارے سکول کا واحد چپڑاسی تھا۔ وہ گھنٹی بھی بجاتا تھا' لڑکوں کو پانی بھی پلاتا تھا اور چھابڑی لگا کر بسکٹ اور باسی پکوڑیاں بھی بیچا کرتا تھا۔

"ارے بد بخت!" لال دین چلا رہا تھا۔ "یہ تو پلیگ کا چوہا تھا۔ اسے ہاتھ کیوں لگایا؟ اب خود بھی مرو گے' ہمیں بھی مارو گے۔"

اپنی لاٹھی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہی کھڑے لال دین نے پلیگ کے مرض پر ایک مفصل تقریر کر ڈالی۔ پہلے تیز بخار چڑھے گا۔ پھر طاؤن کی گلٹی نمودار ہو گی۔ رفتہ رفتہ وہ مکئی کے بھٹے جتنی بڑی نمودار ہو گی۔ جسم سوج کر کپا ہو جائے گا۔ ناک' کان اور منہ سے خون ٹپکے گا۔ گلٹی سے پیپ بہے گی اور چار پانچ دن میں اللہ اللہ خیر سلا ..... ہو جائے گی۔

چند روز بعد میں ریذیڈنسی روڈ پر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک چوہا تیز تیز بھاگتا ہوا سڑک پر آیا۔ کچھ دیر رک کر وہ شرابیوں کی طرح جھوم جھام کر لڑکھڑایا۔ دو چار بار زمین پر لوٹ لگائی اور پھر دھپ سے اوندھے منہ لیٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اسے پاؤں سے ہلایا تو وہ مر چکا تھا۔ بے خیالی میں میں نے اسے دم سے پکڑا اور اٹھا کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ چند راہگیر جو دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے' پکار پکار کر

For more books visit www.4Urdu.com

رگھو ناتھ بازار میں حکیم گوراندتہ مل کی دکان تھی۔ ایک روز حکیم صاحب اپنی کرسی پر اکیلے بیٹھے اپنی ناک پر بار بار بیٹھنے والی مکھیاں اڑا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ کے لہجے میں بولا۔ "حکیم صاحب! پلیگ کی دوا چاہیے۔ بہت جلد"

پلیگ کا نام سن کر حکیم صاحب چونکے اور ڈانٹ کر کہنے لگے۔ "چھاتی پر کیوں چڑھے آتے ہو؟ دور کھڑے ہو کر بات کرو۔ کس کو پلیگ ہے؟"

میں نے روئی کا گالہ ٹنکچر آیوڈین میں تر کر کے ایک میلی سی پٹی کے ساتھ اپنی بغل میں باندھا ہوا تھا۔ میں کھسک کر حکیم صاحب کے اور بھی قریب ہو گیا اور آستین میں سے بازو نکال کر اپنی بغل معائنہ کے لیے ان کے منہ کے قریب لانے لگا' تو ان کی آنکھیں خوف سے ابل کر باہر کی طرف لڑھک آئیں۔

حکیم صاحب بوکھلا کر اتنے زور سے اٹھے' کہ کرسی کھٹاک سے الٹ کر پیچھے کی طرف گر گئی۔ دکان کے اندر دور کھڑے ہو کر وہ چیخنے لگے۔ "یہ دکان ہے دکان' چھوت کی بیماریوں کا ہسپتال نہیں۔ فوراً باہر نکلو اور ہسپتال جا کر حاضر ہو جاؤ۔ ورنہ بلاتا ہوں ابھی پولیس والوں کو۔"

حکیم صاحب کی میز پر گلقند کا مرتبان پڑا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ڈھکنا اٹھایا اور شیرے میں لت پت گلقند کی ایک مٹھی بھر کر دکان سے باہر چلا آیا۔

حکیم گوندراتہ کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ دکان کی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک بار روغن بادام کی کھلے منہ والی بوتل میں مردہ چھپکلی نظر آئی۔ حکیم صاحب نے چمٹے سے پکڑ کر اسے نکال' اور کچھ دیر تک اسے بوتل کے منہ پر الٹا لٹکائے رکھا تا کہ چھپکلی سے ٹپکتے ہوئے بادام روغن کے زیادہ سے زیادہ قطرے بوتل میں واپس گر جائیں۔

حکیم صاحب پر اس کامیاب بلیک میل نے میری ہمت بڑھائی اور حوصلہ بلند کر دیا۔ لوگوں

For more books visit www.4Urdu.com

کی باتیں سن کر دیواروں پر لگے ہوئے محکمہ حفظان صحت کے ہدایت نامے پڑھ پڑھا کر اور پھر خود اپنی روشنی طبع کو خوفناک حد تک بروئے کار لا کر میں نے پلیگ کی علامات' کوائف اور نتائج پر خاصی طویل اور ہولناک قسم کی تقریر ازبر کر رکھی تھی۔ اسے اکا دکا لوگوں پر آزمایا تو نتیجہ خاطر خواہ پایا۔ اچھے اچھے صحت مند اور وضع دار قسم کے بزرگ پلیگ کے ذکر اذکار پر کسی نہ کسی منزل پر پھسل جاتے تھے' اور دفعتہ ان کے متین و فطین چہروں پر توہمات کے کالے کالے کوے بڑے زور و شور سے کائیں کائیں کرنے لگتے تھے۔ موقعوں پر مجھے کامیابی و کامرانی کا وہ نشہ سرشار کر جاتا تھا' جو قوالوں کی پارٹی اس وقت محسوس کرتی ہے جب ان کے کسی بول پر کوئی بے اختیار اٹھ کر حال کھیلنے لگ پڑے۔

سکول میں مولوی عبدالحنان ہمارے اردو اور دینیات کے جواں سال استاد تھے۔ بڑے خوش مزاج' بذلہ سنج اور مہربان۔ گورا رنگ' تیکھا ناک نقشہ' سنہری فرنچ کٹ داڑھی' نرم نرم مترنم آواز' دیدہ زیب خوش قطع لباس۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سبق پڑھاتے پڑھاتے وہ وقتہ فوقتہ اچانک خاموش ہو جاتے تھے اور آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر فرمایا کرتے تھے۔ "سبحان اللہ' سبحان اللہ -------- زندگی بھی عجیب نعمت ہے۔"

ایک روز مولوی عبدالحنان کلاس میں آئے تو بجھے بجھے سے تھے۔ وہ دونوں ٹانگیں میز پر پسار کر کرسی میں نیم دراز ہو گئے اور آنکھیں میچ کر اداسی سے کہا۔ آج طبیعت بحال نہیں۔ سبق نہ ہو گا۔"

باقی لڑکے تو ہنسی خوشی کھیل کود میں مصروف ہو گئے اور میں اپنے چہرے پر فکرمندی کی قلعی کر کے بڑی سنجیدگی سے مولوی صاحب کے قدموں میں آ بیٹھا۔ ان کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ کان تمتمائے ہوئے تھے اور چہرے بشرے پر ہراس و وسواس کی چمگادڑیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں۔ کیس امید افزا تھا۔ اس لیے دو تین بار میں نے کوشش کی کہ انہیں شہر میں طاؤن کی کچھ تازہ خبریں سناؤں۔ لیکن

For more books visit www.4Urdu.com

ہر بار انہوں نے مجھے سختی سے جھڑک کر خاموش کر دیا۔ یہ حربہ کارگر نہ ہوتے دیکھ کر میں نے لال دین چپڑاسی سے شکایت شروع کر دی' کہ وہ سکول کی صفائی کا خاطر خواہ دھیان نہیں رکھتا۔

URDU4U.COM

"خواہ مخواہ لال دین کی چغلی کیوں کھاتے ہو؟" مولوی صاحب نے درشتی سے کہا۔ "کیا کیا ہے اس بیچارے نے؟"

"دیکھئے نا' مولوی صاحب" میں نے گلہ کیا۔ "ہمارے اس کلاس روم میں بھی پلیگ کا چوہا مرا پڑا تھا۔"

تیر نشانے بیٹھا اور مولوی صاحب زور کا جھٹکا دے کر کرسی سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے طاؤن زدہ چوہا ابھی تک وہیں پڑا ہو۔ انہوں نے کئی بار استغفراللہ استغفراللہ پڑھا اور غصے میں بھرے ہوئے غالباً لال دین کی تلاش میں کمرے سے نکل گئے۔

اس کے بعد وہ دو روز سکول نہ آئے۔ تیسرے روز میں ان کی حالت کا سراغ لگانے ان کے گھر گیا۔ مولوی صاحب چادر لپیٹے چارپائی پر ادھ موئے سے پڑے تھے۔ اور ایک پتلی سی نئی نویلی دلہن ایک طرف بیٹھی انہیں پنکھا کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ رچا ہوا تھا۔ پنکھے کی ڈنڈی بھی سرخ تھی۔ جب وہ ہاتھ ہلاتی تھی تو ایسے لگتا تھا کہ مولوی صاحب کی سنہری داڑھی پر خون کی پھوار پڑنے لگے گی۔

مولوی صاحب مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ صادقہ بیگم نے اپنے ہاتھ سے دیسی شکر کے شربت میں ستو گھول کر مجھے پینے کو دیئے۔ پھر اس نے ایک ٹوکری اور کچھ پیسے میرے حوالے کئے کہ بازار سے آلو' مٹر' دھنیا اور گوشت خرید لاؤں۔ سودا سلف خریدنے کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ لیکن میں نے بڑی محنت سے خریداری کی اور واپس آ کر ہر چیز کا بھاؤ' اس کی اصلی قیمت سے کافی کم بتایا۔ پیسوں کا فرق میں نے اپنی پاکٹ منی ملا کر پورا کر دیا۔ صادقہ بیگم خوش ہوئی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "واہ کاکا' تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ بڑی اچھی خریداری کرتے ہو۔ مولوی صاحب کو دیکھنے آ جایا کرو اور مجھے سودا بھی لا دیا کرو۔"

For more books visit www.4Urdu.com

صادقہ بیگم کے حکم کی یہ شان نزول مجھے بڑی اچھی لگی۔ اب میں سکول جانے کی بجائے ہر روز سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچتا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر پاکٹ منی کے علاوہ گھر سے کچھ فالتو پیسے حاصل کرتا اور بڑی محنت سے صادقہ بیگم کے سودا سلف میں سبسڈی لگاتا۔

مولوی صاحب سے رسمی مزاج پرسی کرنے کے بعد میں صادقہ بیگم کے پاس باورچی خانہ میں جا بیٹھتا' کبھی مٹر کی پھلیاں چھیلتا' کبھی پیاز کاٹتا' کبھی مصالحہ پیستا اور جو کام بھی وہ شروع کرتی میں بھاگ بھاگ کر اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔

ایک روز جب میں ان کے ہاں پہنچا تو صادقہ بیگم نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ کالے ریشم کا برقعہ پاس رکھا تھا۔ مولوی صاحب منہ سر لپیٹے خاموش پڑے تھے۔ میں نے حال پوچھا تو انہوں نے چادر کے اندر ہی سے کراہ کر کہا۔ "اللہ' اللہ' حال اچھا نہیں۔"

"گلٹی نکل آئی؟" میں نے پر امید شوق سے پوچھا۔

"تیرے منہ میں خاک" صادقہ بیگم غصے سے پھنکاری۔ "گلٹی کی بیماری تھوڑا ہے' ایسے ہی ذرا سا بخار ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جو نیلی نیلی مخمل سی بچھی تھی' اس پر آنسو پھیل گئے ..... جس طرح شبنم کے قطرے چوٹ کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور اپنے مہندی رنگے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ اس نے اخروٹ کی چھال سے دانت صاف کئے ہوئے تھے اور اس کے پتلے پتلے ہونٹ سرخی سے گلنار ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر سونے اور چاندی کے ورق ہی ورق بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے وہ ابھی بیسن اور دہی اور دودھ سے نہا کر بیٹھی ہو۔ دعا کے بعد اس نے مولوی صاحب پر دم کیا۔ کالے ریشم کا برقع یوں اوڑھا جیسے گڑیا کو فراک پہنایا جاتا ہے' اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "کاکا' میرے ساتھ چلو گے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

میں خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے کوہ قاف پر چلنے کی دعوت مل رہی ہو۔

"روشن شاہ ولی کے مزار پر نیاز چڑھانے جانا ہے۔" صادقہ بیگم نے کہا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

URDU4U.COM

روشن شاہ ولی کا نام میں نے سن رکھا تھا۔ دور ہی دور سے ان کے مزار کی زیارت بھی کر چکا تھا۔ سنگ مر مر کے بلند چبوترے پر ایک بڑی سی قبر تھی جس پر سبز غلاف چڑھا رہتا تھا۔ رات کو سرہانے کئی چراغ جلتے تھے۔ مسلمان تو اندر جا کر فاتحہ درود پڑھتے تھے یا نذر نیاز چڑھاتے تھے لیکن کئی ہندو ڈوگرے بھی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی چار دیواری پر ہاتھ پھیر کر عقیدت مندی سے مزار کو سلام کیا کرتے تھے۔ میں نے بڑی پھرتی سے صادقہ بیگم کو یقین دلایا کہ میں روشن شاہ ولی کے مزار کا راستہ بخوبی جانتا ہوں اور اسے بڑی آسانی سے وہاں لے جاؤں گا۔

چینی کی ایک طشتری میں نیاز کا زردہ تیار تھا۔ صادقہ بیگم نے اسے جالی کے رومال سے ڈھانپ کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے منہ کو زیادہ سے زیادہ سکیڑ کر گول کیا اور زور سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر طشتری کو احتراماً دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ مزار پر چڑھانے کے لیے کورے لٹھے کی ایک چادر تہہ کر کے صادقہ بیگم نے اپنے پاس رکھ لی۔ مولوی صاحب کے محلے سے نکل کر ہم نے مزار کے لیے سالم تانگہ کرایہ پر لیا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ میں پچھلی سیٹ پر عین صادقہ بیگم کے ساتھ بیٹھوں لیکن بیلنس رکھنے کے لیے تانگہ والے نے مجھے آگے بیٹھنے کا حکم دیا۔ پہلے تو میں بڑا آزردہ ہوا لیکن جب پکی سڑک آئی تو مزا آنے لگا۔ دھوپ کی تمازت سے سڑک پر بچھی ہوئی کول تار پگھل پگھل کر رضائی کی طرح نرم ہو گئی تھی۔ اس پر سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی تھپ تھپاہٹ' ربڑ کے ٹائر پہیوں کی لرزاں لرزاں تھرتھراہٹ اور پچھلی سیٹ پر ہوا میں اڑتے ہوئے کالے ریشمی برقع کی سرسراہٹ میرے کانوں میں ہارمونیم اور طبلہ اور ستار بجانے لگی۔ میرا دل اندر ہی اندر گیت گانے

For more books visit www.4Urdu.com

لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میں تانگے سے چھلانگ لگا کر تخت سلیمان پر جا بیٹھا جسے جن اور پریاں ہر وقت اپنے کندھوں پر اٹھائے اڑتے رہتے تھے۔ باہر سڑک پر چلتی پھرتی ساری مخلوق مجھے بڑی اداس' بے حد حقیر' بڑی مفلس اور لا انتہا محرومیوں کی ماری ہوئی نظر آنے لگی۔ اپنی خوش بختی اور خوش وقتی کی ترنگ میں سرشار ہو کر میں نے بے اختیار جالی کا رومال ایک طرف سرکایا اور زور دے کر بڑے بڑے نوالے مزے لے لے کر کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر تانگے والا زور سے غرایا اور چلا چلا کر صادقہ بیگم سے کہنے لگا۔

"بی بی جی! یہ دیکھو' تمہارا لونڈا نیاز جوٹھی کر رہا ہے۔ اب تمہاری منت خاک پوری ہو گی!"

صادقہ بیگم نے برقع اٹھا کر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر شبنم کے موتی بن بن کر لوٹنے لگے۔ میں گم کردہ راہ کتے کی طرح گردن ڈال کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

جب ہم روشن شاہ ولی پہنچے تو صادقہ بیگم مایوسی سے مزار کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"کاکا' یہ تو نے کیا کیا؟" وہ بولی۔ "نیاز جوٹھی کر دی۔ اب ہم مزار شریف پر کیا چڑھائیں گے؟"

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے' جیسے شمع سے موم کے گرم گرم قطرے تیز تیز قطار در قطار ٹپکتے ہیں۔ میں نے بھی اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور زار زار رونے لگا۔ ہمیں روتا دیکھ کر مزار کا ایک ملنگ اٹھ کر آیا اور گرجدار آواز میں بولا۔ "بالکوں کی خیر ------- پیر دستگیر سب مرادیں پوری کرے' بی بی لاؤ تمہارا نذرانہ حضور میں پیش کر دوں۔"

موقع غنیمت جان کر میں نے زردے کی پلیٹ اس کے حوالے کر دی۔ صادقہ بیگم نے لٹھے کی چادر پیش کی۔ ملنگ نے چادر کھول کر اسے اپنے بازوؤں سے ناپا اور مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "بہت چھوٹی چادر ہے۔ بی بی دیکھتی نہیں ہو بڑی سرکار کا

For more books visit www.4Urdu.com

مزار بھی کتنا بڑا ہے؟"

صادقہ بیگم بے بسی سے سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ملنگ کو شاید ترس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "اچھا بی بی' سوا روپیہ ساتھ چڑھا دو۔ اللہ بادشاہ قبول کرے گا۔"

صادقہ بیگم نے اپنی ریزگاری گنی۔ دو ڈھائی آنے میں نے ڈالے اور بڑی مشکل سے سوا روپیہ پورا کر کے ملنگ کے حوالے کیا۔

واپسی پر ہمارے پاس تانگے کا کرایہ نہ تھا۔ میری جیب میں فقط ڈیڑھ آنہ باقی تھا۔ رگھوناتھ بازار کے نکڑ پر پان والے کی دکان آئی تو میں بھاگ کر دو پیسے کے دو میٹھے پان پڑیا میں بندھوا لایا۔ سبزی منڈی میں بیروں کے ٹوکرے ہی ٹوکرے پڑے تھے۔ میں نے دو پیسے کے ڈھیر سارے بیر تلوا کر اپنی ٹوپی میں ڈلوا لیے۔ اب ہم بیر بھی کھاتے جاتے تھے اور مزے مزے کی باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں جان بوجھ کر لمبے لمبے راستے اختیار کرتا تھا تا کہ ہمارا سفر طویل تر ہوتا جائے۔ ایک کوچے میں ملائی کی برف والی لکڑی کی صندوقچی بغل میں دبائے ہانک لگاتا پھر رہا تھا۔ میں نے لپک کر دو پیسے کی برف پیپل کے پتے پر رکھوائی اور بھاگ کر صادقہ بیگم کو دے دی۔ اس نے برقع کے اندر ہی اندر جلدی جلدی برف کھا لی۔ پتہ میں نے چاٹ لیا۔ جب ہم منڈی میں مہاراجہ کے پرانے محلات کے نزدیک آئے' تو میری جیب خالی تھی۔ ورنہ صادقہ بیگم کے لیے ایک آدھ راج محل خریدنے کا خیال بھی ضرور آتا۔ مولوی صاحب کا محلّہ سامنے آیا تو دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اللہ کرے ہمارے پہنچنے تک مولوی صاحب مر گئے ہوں۔ اور میں صادقہ بیگم کے ساتھ اسی طرح گلی گلی' کوچہ کوچہ پان چباتا' بیر کھاتا' برف اڑاتا گھومتا پھرتا رہوں۔ لیکن افسوس کہ مولوی صاحب زندہ سلامت تھے اور بدستور چارپائی پر سر منہ لپیٹے اپنی گلٹی کا انتظار کر رہے تھے۔

اس رات مجھے پوری طرح نیند نہ آئی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو رنگ برنگ خوابوں کے اڑن کھٹولے مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ پٹخ دیتے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میں نے

For more books visit www.4Urdu.com

جلدی جلدی اپنا بستہ سنبھالا اور بھاگتا دوڑتا سیدھا مولوی صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ خود تو موجود نہ تھے لیکن ان کی چارپائی پر صادقہ بیگم ململ کا دوپٹہ اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں باورچی خانے میں گیا تو مولوی صاحب وہاں بھی نہ تھے۔ دوسرا کمرہ دیکھا' وہ بھی خالی تھا۔ میرے دل میں امید کا ایک چھوٹا سا سانپ خوشی سے لہرایا کہ شاید مولوی صاحب مر گئے ہوں اور راتوں رات انہیں دفن بھی کر دیا ہو۔ لیکن پھر اچانک پچھلی کوٹھڑی سے ان کی آواز آئی جیسے کوئی قبر کے اندر سے بول رہا ہو۔ "بیٹا' بات سننا۔"

میں بے صبری سے کوٹھڑی کی طرف لپکا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "مولوی صاحب گلٹی نکل آئی؟"

"بک بک نہ کرو۔" مولوی صاحب نے مجھے جھڑکا۔ وہ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سب سے الگ تھلگ زمین پر اپنا بستر بچھائے بیٹھے تھے اور چائے میں باقر خانی بھگو بھگو کر ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کوٹھڑی سے باہر ہی باہر رہنے کی تلقین کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ "صادقہ بیگم کو تیز بخار ہے۔ رات سے دائیں بغل میں طاؤن کی گلٹی بھی نمودار ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ کو خبر پہنچا دی ہے۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔ بیٹا! اس وقت تک تم بی بی کے پاس بیٹھو' اور اس کی خبر گیری کرو۔" مولوی صاحب نے میری طرف کچھ پیسے پھینک کر کہا۔ "بازار سے برف لے آؤ۔" بی بی کے سر پر رکھو اور شربت بنا کر پلاؤ۔ گلاس باہر گلی کے نلکے پر دھونا' اور اس پلنگ کے پاس الگ رکھ دینا۔ باورچی خانے میں دوسرے برتنوں کے ساتھ نہ ملا دینا۔"

برف لا کر میں نے ایک ڈلی توڑی اور صابن کی طرح اسے صادقہ بیگم کے ماتھے پر ملنے لگا۔ برف کا ٹکڑا گرم گرم توے پر رکھی ہوئی مکھن کی ٹکیہ کی طرح پگھل گیا۔ اور اس کا پانی چھوٹے چھوٹے پرنالوں کی طرح اس کی آنکھوں اور کانوں اور گالوں پر بہنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد صادقہ بیگم نے آنکھیں کھول کر مجھے حیرت سے گھورا اور پھر

For more books visit www.4Urdu.com

ہاتھ سے دھکیل کر مجھے اپنی چارپائی سے اٹھا دیا۔

"ہائے ہائے کاکا' میرے پاس نہ بیٹھو۔ میرے تو پلیگ نکل آئی ہے۔ اللہ تمہیں حفاظت میں رکھے۔"

میں نے جلدی جلدی اٹھ کر شربت بنایا۔ بہت سی برف کوٹ کر اس میں ڈالی۔ صادقہ بیگم غٹ غٹ سارا گلاس ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں دوسرا گلاس بنانے لگا' تو اس نے روک دیا۔ "بس بس کاکا' ابھی نہیں۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

وہ بڑی دیر تک بستر پر لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "میرا منہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ کاکا مجھے ایک میٹھا پان لا دو گے؟"

وہ مجھے دینے کے لیے جیب سے کچھ پیسے نکالنے لگی۔ لیکن میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ رگھوناتھ بازار وہاں سے دو ڈھائی میل دور تھا۔ میں بھاگم بھاگ اسی دکان پر پہنچا جہاں سے ہم نے کل بھی میٹھے پان کھائے تھے۔ چار پان خریدے۔ اور اسی طرح ہانپتا کانپتا واپس پہنچا تو صادقہ بیگم کے میکے والوں نے گھر پر چڑھائی کر رکھی تھی۔ تین چار لوگ اس کی چارپائی کے گرد حصار باندھے بیٹھے تھے۔ دو عورتیں باورچی خانے پر قابض تھیں۔ میں پانوں کی پڑیا صادقہ بیگم کو دینے لگا' تو اس کے والد نے مجھے ڈانٹ دیا اور پڑیا میرے ہاتھ سے چھین لی۔

میں کچھ دیر عضو معطل کی طرح بیکار ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر مولوی صاحب سے بات کرنے پچھلی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر لپیٹے بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ میری آواز سن کر انہوں نے ایک ہاتھ چادر سے نکال کر سرخ جھنڈی کی طرح ہلایا اور مجھے باہر ہی باہر سے دور دفع ہو جانے کو کہا۔ کافی دیر جب کسی نے بھی میرا کوئی نوٹس نہ لیا' تو میں مجبور ہو کر گھر آ گیا۔

رات کو میں نے ماں جی کو بتایا کہ ہمارے دینیات کے ماسٹر صاحب کی بیوی کو پلیگ ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کو بھی گلٹی نکلنے ہی والی ہے۔ میں نے ان کے لیے منت

For more books visit www.4Urdu.com

مانی ہے۔ اس لیے مجھے وہ روشن شاہ ولی کی نیاز پکا دیں۔

"یا اللہ سب کی خیر" ماں جی نے کہا۔ "میں صبح سویرے نیاز پکا دوں گی۔ سکول جاتے ہوئے مزار شریف پر چڑھاتے جانا۔ دعا بھی مانگنا۔ لیکن بیٹا! خبردار' ان کے گھر بالکل نہ جانا۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہے۔ اللہ سب پر اپنا رحم کرے۔"

صبح صبح ماں جی نے کشمش' خوبانی کی گریاں اور ناریل ڈال کر گڑ کے چاول پکائے اور نیاز کے لیے مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں ڈال دیئے۔ پھر انہوں نے سفید چھپیس کی ململ کا ایک نیا دوپٹہ نکالا اور مزار پر چڑھانے کے لیے اسے تہہ کر کے پیالے پر ڈال دیا۔ میں ایک ہاتھ میں سکول کا بستہ اور دوسرے ہاتھ میں نیاز کا پیالہ لے کر خوشی خوشی گھر سے نکلا۔ لیکن روشن شاہ ولی تک پہنچتے پہنچتے میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ مجھے رہ رہ کر مزار کے ملنگ کا خیال آنے لگا' جس نے لٹھے کی چھوٹی چادر کو بڑے مزار پر چڑھانے کے لیے صادقہ بیگم سے سوا روپیہ جرمانہ بھی وصول کیا تھا۔ ململ کا دوپٹہ تو چادر سے بھی چھوٹا تھا۔ اول تو میرے پاس پیسے ہی نہ تھے۔ لیکن اگر ہوتے بھی تو انہیں خواہ مخواہ اس موٹے سے ملنگ پر ضائع کرنا میرا دل قبول نہ کرتا تھا۔

جونہی روشن شاہ ولی کے مزار پر مجھے ملنگ کا یہ بد صورت سا گدھ منڈلاتا نظر آیا۔ میرے دل سے آناً فاناً ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے مزار کو دور ہی دور سے سلام کیا۔ اور وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر آدھے چاول خود کھا لیے اور باقی ایک کبڑی سی بڑھیا کو دے دیئے جو قریب ہی بیٹھی گوبر کے اپلے تھاپ رہی تھی۔

چھپیس کی ململ کا سفید دوپٹہ میں نے تہہ کر کے کتابوں کے درمیان اپنے بستے میں رکھ لیا۔ چلتے چلتے میں نے دل ہی دل میں کئی خیالی پلاؤ پکائے۔ ایک ارادہ تو یہ ہوا کہ میں سیدھا عطاء اللہ رنگریز کی دکان پر چلا جاؤں اور یہ دوپٹہ اسے رنگنے کے لیے دے دوں۔ عنابی' گلابی' فیروزی' کاسنی' انگوری' بسنتی۔ ایک ایک کر کے بہت سے رنگ میرے پردۂ خیال پر لہرائے۔ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو صادقہ بیگم پر پھول کی طرح کھلتا نہ ہو۔

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے بار بار اپنے ذہن پر بڑا زور دے کر سوچا کہ اسے خود کون سا رنگ پسند ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اپنی پسند ناپسند کا کبھی ذکر اذکار ہی نہ کیا تھا۔

URDU4U.COM

لیکن جس طرح ہو آج میں اس سے ضرور پوچھ کے رہوں گا' کہ اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔ اگر اس نے صاف صاف بتا دیا تو خیر ------- ورنہ دوسرا منصوبہ میں نے بنایا کہ میں یہ دوپٹہ دین محمد بٹ سے رنگوا لوں گا جو چنریوں اور صافوں پر رنگ برنگ لہریئے ڈالنے میں سارے شہر میں مشہور تھا۔ سکول کی استانیاں اور کالج کے لڑکے جب اس کی کاریگری سروں پر سجا کر باہر نکلتے تھے تو سڑکوں پر ہر طرف بہار ہی بہار آ جاتی تھی۔ دل ہی دل میں گونا گوں رنگوں' خوشبوؤں اور خیالوں کے تانے بانے بنتا جب میں مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو شیخ چلی کے انڈوں کی ٹوکری کھٹاک سے زمین پر گر گئی۔ اس کا بنا بنایا کنبہ برباد ہو گیا۔ اس کے سجے سجائے گھروندے مسمار ہو گئے۔ کیونکہ ڈیوڑھی میں صادقہ بیگم کا جنازہ تیار رکھا تھا۔ اور آٹھ دس گدھ نما آدمی قبرستان چلنے کے لیے گلی میں منڈلا رہے تھے۔

میں گھبرا کر مولوی صاحب کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چادر اوڑھے بیٹھے تھے اور رو رو کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے بائیں ہاتھ سے مجھے دھتکارا اور غصے سے چلائے۔ "میری طرف منہ اٹھائے کیوں چلے آ رہے ہو؟ جاؤ بی بی کے جنازے میں شرکت کرو۔"

انہوں نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھے اور کڑک کر کہا۔ نماز جنازہ کی نیت اور ارکان یاد ہیں یا بھول گئے؟ کئی بار پڑھا چکا ہوں۔"

"ہاں ہاں' یاد ہیں۔" میں نے بلند آواز سے کڑک کر جواب دیا۔ اور دبے لفظوں میں نماز جنازہ کی نیت' نماز جنازہ کے ارکان اور مولوی صاحب کی ماں بہن کو بڑی فحش گالیاں دیں۔

"یہ ہاں ہاں کیا ہوتا ہے؟" مولوی صاحب سانپ کی طرح پھنکارے۔ "جی نہیں کہا جاتا' سور کہیں کے!"

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے دل ہی دل میں انہیں چند اور گالیاں دیں اور پھر زبان باہر نکال کر ان کا منہ چڑا دیا۔ مولوی صاحب نے جھپٹ کر اپنا جوتا اٹھایا اور زور سے میری طرف پھینکا لیکن نشانہ خطا گیا۔

URDU4U.COM

گھر سے تو جنازے کے ساتھ دس بارہ آدمی چلے تھے لیکن قبرستان تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ چھ ہی باقی رہ گئے۔ قبرستان میں خوب چہل پہل تھی۔ گورکن بھی خوب مصروف تھے۔ تین چار قبریں پاس پاس کھد رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے صادقہ بیگم کو لحد میں اتارا اور جلدی جلدی بیلچے چلا کر اس کے تن بدن پر بھوری بھوری مٹی کا اونچا سا انبار لگا دیا۔ ایک شخص نے پانی کا آدھا پیپا انڈیل کر قبر پر چھڑکاؤ کیا اور فاتحہ پڑھ کر سب لوگ لوٹ گئے۔

میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو چھبیس ململ کا دوپٹہ کم از کم صادقہ بیگم کے مزار پر ہی چڑھا دوں۔ لیکن دوسرے جنازوں کے کچھ لوگ آس پاس کھڑے تھے اس لیے میں جھینپ گیا اور اپنا بستہ بغل میں دبا کر چپ چاپ واپس چلا آیا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• نندہ بس سروس

جموں میں جب پلیگ کے کیس دن بہ دن بڑھتے ہی گئے تو گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے سری نگر بھیج دیا جائے۔

URDU4U.COM

سری نگر کے لیے ہم نندہ بس سروس کی لاری میں سوار ہوئے۔ اس کے اندر اور باہر چاروں طرف موٹے موٹے حروف میں کالی اور سرخی سیاہی میں "نندہ ہاؤس بزازی سستی" کے اشتہار ہی اشتہار تھے۔ نندہ ہاؤس جموں کشمیر میں کپڑے کی سب سے بڑی اور کشادہ دکان تھی۔ اس میں آٹھ دس کارندے ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن دکان کے مالک نندہ صاحب خود بھی بنفس نفیس صبح سے شام تک بڑے انہماک سے کام کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے فربہ تن و توش کے بے حد لحیم و شحیم آدمی تھے اور اپنا وزن قابو میں رکھنے کے لیے ہر روز علی الصبح باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ سڑک پر ایک دو فرلانگ لشتم پشتم چہل قدمی کیا کرتے تھے جس طرح بادبانی جہاز سطح آب پر ہچکولے کھاتا ہے۔ اور پھر لکڑی کی دو ڈھائی فٹ اونچی چوکی پر کھڑے ہو کر بر سر عام دس بارہ چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ حفظان صحت کے ان تقاضوں کو پورا کر کے نندہ صاحب اپنی دکان کے فرش پر ٹانگیں پسار کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتے تھے۔ گاہک چھوٹا ہو یا بڑا' امیر ہو یا غریب' ہزاروں کے مال کا خریدار ہو یا دو تین گز ململ کا طلبگار' نندہ صاحب سب کے ساتھ یکساں اخلاق' انہماک اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کے کارندے گاہکوں کے سامنے کپڑوں کے تھانوں پر تھان کھول کھول کر ڈھیر لگاتے جاتے تھے' اور چھوٹے سے چھوٹا گاہک بھی وہاں سے عزت نفس کا ایسا احساس لے کر اٹھتا تھا کہ پھر عمر بھر اس کے لیے کسی اور دکان کا منہ دیکھنا

For more books visit www.4Urdu.com

ہندو تنظیمیں ان کی مالی اعانت کی مرہون منت تھیں۔ خاص طور پر ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے تربیتی اکھاڑوں پر ان کی بڑی نظر عنایت تھی۔ ان اکھاڑوں میں ہندو نوجوانوں کو جنگی کرتب سکھائے جاتے تھے تا کہ مسلمانوں کے ساتھ مقابلے میں وہ ان پر ہمیشہ غالب آئیں۔ ایک خفیہ کلب میں ہندوؤں کو خصوصی ٹریننگ دے کر جوانوں کا ہراول دستہ تیار کیا جاتا تھا کہ جب مسلمان عید میلاد النبی کا جلوس نکالیں تو اس پر حملہ کر کے اسے درہم برہم کر دیا جائے۔ نندہ صاحب ان تمام انتظامات کی بڑی خاموشی اور خوشدلی سے سرپرستی فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عید میلاد النبی اور محرم کے جلوسوں کے پانی کی کچھ سبیلیں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے لگایا کرتے تھے۔

نندہ بس سروس کی جس لاری میں ہم سوار ہوئے' اس میں پندرہ کے قریب اور مسافر بھی تھے۔ ایک پرنس آف ویلز کالج کا کشمیری پنڈت پروفیسر تھا۔ جو اپنی پنڈتانی کے ساتھ گرمی تعطیلات گزارنے سری نگر جا رہا تھا۔ اس شدت کی گرمی میں پنڈتانی نے ابھی سے اونی فرن پہن رکھا تھا' اور سر سے پاؤں تک پشمینے کی گرم چادر اوڑھی ہوئی تھی' اس کے ایک ہاتھ میں پانی کی گڑوی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک کانگڑی تھی۔ کانگڑی نصف کے قریب راکھ سے بھری ہوئی تھی' تا کہ پیچ در پیچ پہاڑی سڑک کے موڑوں پر جب پنڈتانی کا جی متلائے تو وہ بے تکلفی سے اس میں قے کرتی جائے۔

ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی گوری چٹی' بھاری بھر کم عورت چنار کے درخت کی طرح پھیلی ہوئی تھی جس پر خزاں کے موسم میں پت جھڑ کا عمل تیز رفتاری سے شروع ہو چکا تھا۔ اس کا آدمی اس کے عین پیچھے والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے گیبرڈین کی برجس اور بند گلے کا چست کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سلیٹی رنگ کی ترچھی فیلٹ ہیٹ تھی جس میں مور کے کئی پر آویزاں تھے۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی سیاہ عینک تھی۔ کندھے سے براؤن چرمی تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس میں کیمرہ' دوربین' ٹافیاں اور شراب کی ایک لمبی سی بوتل تھی۔ وقتہ فوقتہ وہ اس بوتل سے چسکی

For more books visit www.4Urdu.com

دشوار ہو جاتا تھا۔ یوں بھی تھان میں سے کپڑا پھاڑتے وقت نندہ صاحب ایک دو انگل کپڑا گاہک کے حصے میں بڑھا دیتے تھے' اور قیمت کے مول تول میں کچھ ایسا ہنس مکھ رویہ اختیار کرتے تھے گویا ان کا اصلی مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خریدار کا دل خوش کرنا ہے۔ کاروبار کی اس خوش کاری کے ساتھ ساتھ نندہ صاحب کو اشتہار بازی کے فن پر بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ شہر اور گاؤں کے در و دیوار ہوں یا جنگل میں درختوں کے تنے' دور دراز ویرانوں میں پتھریلی چٹانیں ہوں' یا آبادیوں میں بجلی کے کھمبے' ہر جگہ کونے کونے اور گوشے گوشے میں "نندہ ہاؤس برازی سستی" کا کتبہ موٹے موٹے حروف میں نگاہوں کا تعاقب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نندہ صاحب کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے۔ برازی کی دکان تو دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ اب انہوں نے لاہور سے جموں اور جموں سے سری نگر تک ایک منظم بس اور ٹیکسی سروس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی جموں میں پہلا سینما ہال بنانے اور چلانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر رہا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی خوشامد میں انہوں نے اس کا نام "ہری ٹاکیز" رکھا۔

چاپلوسی اور خوشامد کے فن میں بھی نندہ صاحب بڑے اہل کمال تھے۔ عام خریداروں سے لے کر والیان ریاست کی خوشنودی حاصل کرنا تو ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن دائیں ہاتھ سے وہ اپنے بھگوان کو راضی رکھنے کے لیے بھی بڑے جتن کرتے تھے۔ ان کی فیاضی اور داد و دہش کے عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ یہ بات زبان زد خاص و عام تھی کہ شام کو دکان بڑھا کر وہ بہت سی ہندو بیواؤں' یتیموں اور محتاجوں کے ہاں بذات خود جاتے تھے' اور ایک مخصوص قسم کا "گپت دان" ان میں تقسیم کرنے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں رکھتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا' بارش ہو یا آندھی' کاروبار میں نفع ہو یا نقصان' خفیہ اور خاموش خیرات کے اس تسلسل میں ناغہ نہ پڑتا تھا۔ جس پابندی سے نندہ صاحب "مایا دھرم" کا پالن کرتے تھے' اسی طرح وہ ہندو جاتی کی سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے بھی خفیہ طور پر مستقل جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ شہر کی بہت سی

For more books visit www.4Urdu.com

لگا کر تھیلے سے کیمرہ' دوربین اور ٹافیاں برآمد کرتا تھا اور اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک چھریری سی خوبصورت پارسی لڑکی کو کھلونوں کی طرح دکھاتا تھا۔ بس میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے جملہ مسافروں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ بمبئی کے ایک بہت بڑے آغا ہیں۔ ہر سال گرمیوں میں شکار کھیلنے کشمیر آتے ہیں۔ اور مہاراج اور ادھیراج کے مہمان ہونے کا شرف پاتے ہیں۔ اس بار بھی جب وہ سری نگر پہنچیں گے تو امید واثق ہے کہ خبر پاتے ہی ہزہائنس انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شاہی مہمان خانے کی زینت بنائیں گے۔ مسافروں میں کون ایسا کافر تھا جو اس امید کے بر آنے پر فی الفور ایمان نہ لے آتا۔ کیونکہ جو نسیم بہار ایسے غنچہ امید کو وا کرتی ہے اسے آغا صاحب احتیاطاً بمبئی ہی سے پارسی لڑکی کی صورت میں اپنے ساتھ لیتے آئے تھے' اور وہ راج محل کے لیے پروانہ راہداری کی طرح ان کے پہلو میں بیٹھی مزے مزے سے ٹافیاں کھا رہی تھی۔

آغا صاحب کی تقریر دلپذیر کا مسافروں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ اپنی اپنی سیٹ پر اور بھی زیادہ دبک کر سکڑ گئے۔ سکھ ڈرائیور بھی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے کلینر کو ڈانٹا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے اور گاڑی کو فوراً اسٹارٹ کرے۔ کلینر نے اچھل کر اچھل کر زور زور سے ہینڈل گھمایا۔ انجن نے دو چار احتجاجی سسکیاں لیں اور پھر کڑک کر چالو ہو گیا۔ بس کے پہیوں نے حرکت کی تو گرم شال میں لپٹی ہوئی پنڈتانی نے بھی آغاز سفر کا شگون لیا۔ اور عاؤ عاؤ کر کے کانگڑی میں اپنی پہلی قے کر ڈالی۔

شہر سے نکل کر رام نگر سے گزرے تو مہاراجہ اور مہارانی کے محلات آئے۔ آغا صاحب پارسی لڑکی کے سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور سرگوشیوں میں اسے راج محل کی داستان الف لیلیٰ مزے لے لے کر سنانے لگے۔ فرنٹ سیٹ پر چھائی ہوئی خزاں دیدہ بیگم کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اپنے نازک سے صندلی پنکھے کی ڈنڈی گھما کر آغا صاحب کا منہ پارسی لڑکی کے کانوں سے اس طرح الگ کر دیا جیسے بلی کے منہ سے چھیچھڑا

For more books visit www.4Urdu.com

کھینچ لیا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے اپنے چقندر جیسے چہرے پر بھڑوں کے چھتے کی طرح لٹکی ہوئی مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے مروڑا اور خشونت سے پنڈتانی کو گھورا جو کانگڑی میں منہ دیئے بڑی پابندی سے اپنا فریضہ استفراغ ادا کر رہی تھی۔

"یہ بس ہے یا چمار خانہ؟" آغا صاحب گرجے۔ "چاروں طرف بدبو ہی بدبو پھیلا رکھی ہے۔ توبہ توبہ' ناک میں دم آ گیا ہے۔"

آغا صاحب کی ناراضگی بھانپ کر کلیز اپنی جگہ سے اٹھا اور پنڈت اور پنڈتانی کو دھکیل دھکال کر سب سے الگ تھلگ بس کے آخری کونے میں بٹھا دیا۔ پنڈتانی کو تو خیر آرام ہو گیا کہ وہ جب جی چاہے کھل کر بے روک ٹوک قے کرتی جائے لیکن کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب کا نخل تمنا برباد ہو گیا۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ آغا صاحب کے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں تو انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ اس وسیلہ کو اپنی مقصد براری کے لیے ضرور کام میں لائیں گے۔ پروفیسر صاحب کئی برس سے تگ و دو کر رہے تھے کہ کسی طرح ان کا تبادلہ پرنس آف ویلز کالج جموں سے سری پرتاب کالج سری نگر ہو جائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ اب بس میں آغا صاحب کو ہم سفر دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ شاید یہ فرشتہ رحمت ان کی حاجت روائی کے لیے ہی غیب سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ وہ بڑی محنت سے کھسک کھسک کر آغا صاحب کی سیٹ کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

کچھ عجب نہیں کہ سری نگر تک پہنچتے پہنچتے وہ پارسی لڑکی سمیت آغا صاحب کو شیشے میں اتار لیتے' کیونکہ کشمیری پنڈت کی شان یہ ہے کہ اسے کسی دفتر کی ادنیٰ سے ادنیٰ اسامی پر تعینات کر دیا جائے تو وہ دیمک کی طرح سارے عملے کو اندر ہی اندر چاٹ کر اوپر والی کرسی پر سر نکالتا ہے۔ لیکن کلیز نے انہیں پیچھے دھکیل کر سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ اب پنڈتانی تو بڑے اطمینان سے کانگڑی میں منہ ٹھونسے بیٹھی تھی اور پروفیسر صاب بصد حسرت و یاس ان خوش قسمت مسافروں کا منہ تک رہے تھے جنہیں

For more books visit www.4Urdu.com

اب بھی آغا صاحب کی سیٹ کا قرب حاصل تھا۔

رام نگر سے ذرا آگے سکھ ڈرائیور نے بس کی رفتار احتراماً ہلکی کر دی۔ کیونکہ یہاں پر نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے درمیان "پنج پیر" کی کہنہ اور بوسیدہ سی قبریں تھیں۔ کچھ مسافروں نے گردن جھکا کر "پنج پیر" کو سلام کیا۔ اب پہاڑی راستہ شروع ہونے والا تھا اور بس گھاؤں گھاؤں کرتی پیچ در پیچ سڑک پر چلنے لگی جو بھورے پہاڑ اور سبز درختوں کے ساتھ کالے ربن کی طرح لپٹی ہوئی کبھی اوپر اٹھتی تھی' کبھی نیچے لڑھکتی تھی اور کبھی بڑے بڑے بیضوی دائرے کاٹ کر نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ ایک طرف سنگلاخ چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ دوسری طرف پر مہیب گہرائی ہی گہرائی۔ جگہ جگہ پہاڑی جھرنوں کا پانی چھوٹی چھوٹی شفاف چادریں بن کر چٹانوں کے اوپر بہتا تھا۔ سڑک کے کنارے پکے چبوترے اور حوض بنے ہوئے تھے۔ اور جھرنوں کا پانی لوہے کے نل کے ذریعے چوبیس گھنٹے ان پر گرتا رہتا تھا۔ ہندو ڈوگرے ان نلوں کی دھار کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے بھی تھے' کپڑے بھی دھوتے تھے' پانی بھی پیتے تھے۔ مسلمانوں کو ان چبوتروں کے پاس تک پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ ان کے چھونے سے چشمے کا صاف پانی ناپاک ہو کر بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ جو بچا کھچا مستعمل پانی چبوتروں سے بہہ کر نکلتا تھا' اس کی نکاس سڑک کے دوسری جانب نشیب کی طرف تھی۔ یہاں سے یہ از سر نو ایک بیمار سی آبجو بن کر نیچے کی طرف رواں ہو جاتا تھا۔ اس سیکنڈ ہینڈ پانی کو اپنے استعمال میں لانے کے لیے مسلمانوں کو کھلی چھٹی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے بس کا پانی بدلنے کے لیے ایک چشمہ کے پاس پڑاؤ کیا اور مسافروں کو وارننگ دی کہ یہاں سے چل کر اب وہ اودھم پور پہنچ کر رکے گا۔ اس لیے جس نے کچھ کھانا پینا ہو وہ یہیں سے کھا پی کر چلے۔ سڑک کے کنارے ایک چھپر میں حلوائی اور سوڈا واٹر کی دکان تھی۔ ایک تھال میں باسی پکوڑے تھے جن پر کچھ مکھیاں بے دلی سے منڈلا رہی تھیں۔ دوسرے تھال میں لڈو تھے جن پر

For more books visit www.4Urdu.com

سری نگر بانہال روڈ کی گرد اس قدر تہہ در تہہ جمی ہوئی تھی کہ ان پر مکھیوں نے بھی بھنبھنانا چھوڑ دیا تھا۔ لکڑی کے برادے میں لت پت برف کی سل ایک میلے سے ٹاٹ میں لپٹی ہوئی تھی اور لیمونیڈ کی بہت سی بوتلیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔

سب سے پہلے دکاندار نے پتوں کے دونے میں پکوڑیاں اور لڈو ڈال کر لیمونیڈ کی ایک ایک بوتل کے ساتھ بس کے ڈرائیور اور کلینر کو نذرانہ دیا۔ آغا صاحب اپنی بیگم اور پارسی لڑکی کو لے کر سائے میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اپنی تھرموس' شراب' گلاس اور سینڈوچ نکال کر پکنک منانے لگے۔ باقی مسافروں نے لیمونیڈ کی بوتلوں پر یورش کی۔ دکاندار نے چار چار لڈو اور کچھ پکوڑے ڈال کر بہت سے دونے تیار کر رکھے تھے۔ جو مسافر لیمونیڈ طلب کرتا' اسے مٹھائی کا ایک دونا بھی زبردستی خریدنا پڑتا تھا۔ باقی سب مسافر تو خیر اپنی اپنی بوتل اور گلاس اور برف لے کر چھاؤں میں بیٹھ گئے لیکن سات آٹھ مسلمان پسنجروں کو لیمونیڈ پینے میں بڑی دیر لگی۔ دکان سے باہر کونے میں ایک ٹوکری لٹک رہی تھی۔ اس میں کانچ کا ایک میلا سا گلاس اوندھا پڑا تھا۔ مسلمان خریدار اس گلاس کو اٹھا کر فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلائے دکاندار کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ دکان والا دور ہی دور سے اس میں برف کی ڈال چھناک سے پھینکتا تھا اور پھر بوتل کھول کر ڈیڑھ دو فٹ کی بلندی سے گلاس میں لیمونیڈ انڈیل دیتا تھا۔ کچھ جھاگ خریدار کے ہاتھ پر پڑتی تھی' کچھ چھینٹے اس کے کپڑوں پر اڑتے تھے اور دو تین گھونٹ بوتل میں بچ رہتے تھے' جسے منہ لگا کر اور ڈکار مار کر حلوائی خود ہضم کر لیتا تھا۔ لیمونیڈ پی کر ہر مسلمان اپنا گلاس دھو کر دوسرے خریدار کے لیے باہر والی ٹوکری میں لٹکا دیتا تھا۔ بس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا کر جلدی مچا رہا تھا۔ کلینر بھی بے صبری سے آوازیں دے رہا تھا۔ آغا صاحب الگ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ البتہ کشمیری پنڈت پروفیسر مطمئن بیٹھے تھے۔ انہوں نے حلوائی کی بھٹی سے پنڈتانی کی کانگڑی میں نئی راکھ مفت بھر لی تھی اور موقع پا کر آغا صاحب کے ساتھ اپنی گفتگو کی تمہید بھی باندھ لی تھی۔

For more books visit www.4Urdu.com

کلینر سے ساز باز کر کے انہوں نے اپنی جگہ بدل لی تھی۔ اور پنڈتانی کو پچھلی سیٹ پر اکیلے چھوڑ کر اب وہ آغا صاحب کے بالکل قریب آ بیٹھے تھے۔

URDU4U.COM

بس دوبارہ روانہ ہوئی تو تا نہ دم تھی لیکن ڈرائیور کا موڈ بہت جلد خراب ہو گیا۔ سڑک پر تاحد نظر تتر بتر انسانوں کی لائن ہی لائن لگی ہوئی تھی۔ میلے میلے' بھورے بھورے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خمیدہ کمر لوگ دو دو تین تین من وزن پیٹھ پر اٹھائے رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے' جیسے دیوار پر چیونٹیوں کی بے ترتیب قطاریں چل رہی ہوں۔ انہوں نے خشک گھاس کے بنے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے۔ اور ان کے تمتماتے ہوئے چہرے پسینے میں شرابور تھے۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ کے نمائندے تھے۔ جنہیں عرف عام میں "ہاتو" کہا جاتا تھا۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی وہ اپنا فردوس بر روئے زمین چھوڑ کر پا پیادہ قافلہ در قافلہ پنجاب کے میدانوں میں اتر جاتے تھے۔ ان کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بنتی تھیں یا شال اور غالیچے کاڑھتی تھیں یا پھولدار نمدے بناتی تھیں یا اخروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگریٹ کیسوں' تپائیوں اور پھولدانوں پر نقش و نگار کھودتی تھیں' جنہیں مقامی ساہوکار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمت پر بیچ ڈالتا تھا۔ سنسان راتوں میں برفانی ہوا کے جھکڑ درختوں اور دیواروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر خوفناک چیخیں مارتے تھے۔ وقتہ فوقتہ برف کے بڑے بڑے تودے چھتوں سے گر کر سناٹے میں زلزلوں کا ارتعاش پیدا کرتے تھے۔ تیل کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ کانگڑیوں کی آگ سلگ سلگ کر راکھ ہو جاتی تھی۔ لیکن لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کابکوں میں محبوس بوڑھی اور جوان عورتوں کی فنکار انگلیاں اپنے کام میں لگاتار مصروف رہتی تھیں۔ دھڑکتے ہوئے دلوں سے وہ کبھی حضرت شاہ ہمدان کی حکایات میں مگن ہو جاتی تھیں' جنہوں نے وادی کشمیر میں اسلام کی شمعیں روشن کی تھیں۔ کبھی وہ للہ عارفہ کے گیتوں میں صبر و قرار کا سہارا ڈھونڈتی تھیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

صبر، بیٹا، صبر
صبر تو ایک سنہری پیالہ ہے
یہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کو یارا نہیں

صبر، بیٹا، صبر
صبر تو نمک، مرچ اور زیرہ کا تیز مرکب ہے
یہ اتنا تلخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں

جب کبھی برف و باراں کا طوفان تنہائی کی راتوں کو اور بھی تاریک اور طویل کر دیتا تھا تو ان کے شوق کی گہرائیوں سے ہبہ خاتون کے درد و فراق کے نغمے لہرانے لگتے تھے۔

ویو میانہ پوشے مدنو --------

میں سب رہگذاروں پر پھولوں ہی پھولوں کی سیج بچھا دوں گی
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب
آ جاؤ
آؤ کہ
ہم مرغزاروں میں یاسمن، نسرین اور گلاب کے پھول چنیں
آؤ کہ
ہم دونوں کنار دریا چلیں
ساری دنیا نیند کی آغوش میں بے ہوش پڑی ہے
میں تیرے لیے سراپا انتظار بیٹھی ہوں
اے میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب
آ جاؤ
ویو میانہ پوشے مدنو --------

حضرت آدم علیہ السلام تو دانہ گندم کی پاداش میں خلد سے نکلے تھے لیکن ڈوگرہ راج

For more books visit www.4Urdu.com

میں کشمیری مسلمان دانہ گندم کی تلاش میں اپنی جنت ارضی سے نکلنے پر مجبور تھا۔ سردیاں آتے ہی وہ گلمرگ' گاندھر بل' اچھابل' تراگ بل' بانڈی پور اور پانپور کے کوہساروں اور مرغزاروں سے نکل کر پنجاب کی دور دراز منڈیوں میں پھیل جاتے تھے۔ دن بھر غلے اور لوہے اور کپڑے کی بار برداری کرتے تھے۔ بسوں اور تانگوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے تھے۔ لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے تھے اور شام کو مرغی کے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اکٹھے بیٹھ کر کچھ چاول ابال لیتے تھے۔ خشکہ رات کو کھا کر کھلے آسمان تلے سو رہتے تھے اور صبح اٹھ کر رات کی بچی ہوئی پچھ میں نمک ملا کر دن کا کھانا بنا لیتے تھے۔ اس طرح خون پسینہ ایک کر کے گرمیوں میں جب وہ کچھ نقدی بچا کر اور دو ڈھائی من سامان پیٹھ پر لاد کر اپنی جنگ گم گشتہ کی طرف واپس لوٹتے تھے' کہیں کسٹم والے ان کا مال لوٹتے تھے' کہیں کوئی ڈوگرا سردار بر سر عام ڈرا دھمکا کر ان کی پونجی ہتھیا لیتا تھا' کہیں پولیس اور محکمہ مال کے اہلکار انہیں سر راہ پکڑ کر کئی کئی دن کئی کئی ہفتے مفت کی بیگار میں لگائے رکھتے تھے۔ یوں بھی کشمیری مسلمان کا بال بال ڈوگرا حکومت کے لا تعداد ٹیکسوں میں جکڑا رہتا تھا۔ پھولوں پر ٹیکس' سبزی پر ٹیکس' بھیڑ' بکری اور گائے پر ٹیکس' چولہا ٹیکس' کھڑکی ٹیکس' اون ٹیکس' شال ٹیکس' بخار اور خیاط پر ٹیکس' مزدور اور معمار پر ٹیکس' نانبائی اور لوہار پر ٹیکس' ملاح اور کمہار پر ٹیکس' ارباب نشاط پر ٹیکس ------- بس فقط ایک حجام تھا' جو ٹیکسوں کی مکڑی کے جالے میں کسی وجہ سے گرفتار نہ تھا۔

کشمیری مسلمانوں کا مال و متاع تو ہر وقت ریاست کے اہلکاروں' خفیہ نویسوں' رئیسوں اور جاگیرداروں کے رحم و کرم پر رہتا ہی تھا' اس غریب کی جان بھی اپنی سر زمین میں بے حد ارزاں تھی۔ ایک زمانے میں کشمیری مسلمان کی زندگی کی قانونی قیمت مبلغ دو روپے تھی۔ اگر کوئی سکھ یا ڈوگرا کسی مسلمان کو جان سے مار ڈالتا تھا' تو عدالت قاتل کو سولہ سے بیس روپیہ تک جرمانہ عائد کر سکتی تھی۔ دو روپے مقتول کے لواحقین کو

For more books visit www.4Urdu.com

عطا ہوتے تھے اور باقی رقم خزانہ عامرہ میں داخل ہوتی تھی۔ جس وقت انگریزوں نے اس جنت ارضی کو ڈوگروں کے ہاتھ فروخت کیا تو یہ نرخ ذرا بالا ہو گیا۔ کشمیر کا سودا ۷۵ لاکھ روپے پر طے ہوا تھا۔ اس وقت کی آبادی کے حساب سے باشندوں کی قیمت سات روپے فی کس کے قریب پڑی تھی۔ ڈوگرہ راج میں کسی وقت مسلمانوں کی زندگی ایک گائے کا درجہ بھی نہ پا سکی۔ شروع شروع میں گاؤ کشی کی سزا موت تھی۔ ملزم کو رسیوں سے باندھ کر سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا' اور پھر بر سر عام پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا' لیکن بعد میں بھی گائے ذبح کرنے کی سزا دس سال قید بامشقت ہمیشہ رہی۔ کئی جگہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھیڑ یا بکری قربان کے لیے بھی حکومت کی اجازت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ جو کبھی ملتی تھی' کبھی نامنظور ہو جاتی تھی۔ ان سب دشواریوں' رکاوٹوں' پابندیوں اور لوٹ مار کے باوجود کشمیری "ہاتو" اپنی سر زمین کے ساتھ والہانہ طور پر وابستہ تھا۔ پنجاب کے میدانوں اور منڈیوں میں اسے اجرت بھی زیادہ ملتی تھی۔ بیگار بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اور بڑا گوشت کھانے پر قید کی سزا تھی نہ موت کی۔ لیکن گرمیاں آتے ہی وہ رسے تڑا کر بھاگ اٹھتا اور اپنا مال و متاع پیٹھ پر لاد کر پاپیادہ کشاں کشاں اپنی دور افتادہ وادیوں کی راہ لیتا تھا۔ بانہال سری نگر روڈ پر جا بجا ان کے قافلے اپنی جنگ گم گشتہ کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کو دیکھ کر پہلے تو ہماری بس کے ڈرائیور کی رگ ظرافت پھڑکی۔ ایک موڑ پر بھاری بھر کم بوجھ تلے دبے ہوئے چند خمیدہ کمر کشمیری سڑک کے بیچ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے عین ان کے پیچھے پہنچ کر زور سے ہارن بجا دیا۔ وہ خوف سے کانپ اٹھے اور بد حواس ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ کوئی لڑھک کر گھٹنوں کے بل گرا۔ کوئی بس کے مڈگارڈ سے ٹکرایا۔ کسی نے لجاجت سے ہاتھ باندھ کر ڈرائیور کی منت کی۔ کچھ مسافر کھسیانی سی ہنسی ہنسے۔ آغا صاحب نے زور دار قہقہے بلند کئے۔ نوجوان پارسی لڑکی اس نظارے سے خاص طور پر محظوظ ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ آغا صاحب کا کیمرہ لیا اور سڑک پر گرتے پڑتے بد

For more books visit www.4Urdu.com

حواس لوگوں کی تصویریں اتارنے لگی۔ فوکس ٹھیک کرنے کے لیے آغا صاحب نے لڑکی کا سر اپنے سینے سے لگا کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بیگم نے صندلی پنکھے کی ڈنڈی ان کے کان میں چبھو کر اس بندوبست میں رخنہ ڈالا اور بس شاداں و فرحاں گھاؤں گھاؤں کرتی اگلے موڑ پر پہنچی۔ یہاں بھی ہاتوؤں کے ساتھ وہی تماشا ہوا۔ پھر اس سے اگلے موڑ پر -------- پھر اس سے اگلے موڑ پر -------- تین چار موڑوں کے بعد سب کی طبیعت اس دلپسند مشغلے سے سیر ہو گئی۔ اب اگر کوئی کشمیری سڑک کے درمیان نظر آتا' تو ڈرائیور کے مزاج کا پارہ چڑھ جاتا۔ اور وہ سیاہ چشمان کشمیر کی آل اولاد کو کئی پشت تک بڑی غلیظ گالیاں دیتا۔ کلینر بھی ایک موٹا سا سونٹا لے کر بس کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اور اسے گھما گھما کر راستہ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوئے بچارے کشمیری بے بسی سے پریشان ہو کر سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے تھے' اور پہاڑی ڈھلوانوں پر سایہ دار درختوں کے نیچے پکے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے ڈوگروں کے لیے بڑی ضیافت طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔

لانبے لانبے کرتوں اور چوڑی دار پاجاموں میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والے ڈوگرے ریاست میں شاہی اولاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسیع جنگلات ہوں یا ایک دو ایکڑ اراضی' وہ اپنے نام کے ساتھ راجہ یا ٹھاکر یا دیوان کا دم چھلا ضرور لگاتے تھے اور چھاتی نکال کر ایسے دم خم سے چلتے پھرتے تھے جیسے وہ ابھی ابھی راج محل کے پنگھوڑے سے انگوٹھا چوستے ہوئے برآمد ہوئے ہوں۔ ان کی اراضیاں مسلمان مزارعے کاشت کرتے تھے۔ ان کے مویشی مسلمان بچے جنگلاتی چراگاہوں میں چراتے تھے۔ اور وہ خود آلتی پالتی مار کر بیٹھے چلم پیا کرتے تھے۔ چلم پینے کے علاوہ اپنے گھٹے ہوئے سر پر بر سر عام تیل کی مالش کرانا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مالش کے بعد وہ اپنی چندیا پر لہراتی ہوئی سات آٹھ انچ لمبی "بودی" کو مونچھوں کی طرح تاؤ دیتے تھے' اور دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رسی کی طرح بٹ کر پیچ در پیچ کارک سکرو کی مانند اینٹھ لیتے تھے۔ ان عجیب الخلقت

For more books visit www.4Urdu.com

ڈوگروں کے آس پاس شیشم اور دیار اور چیڑھ کے درختوں کے نیچے اگر کوئی بانکی ترچھی ڈوگری سر پر پیتل کی دمکتی ہوئی گاگر اٹھائے لٹکتی مٹکتی گزر جاتی تھی تو پہاڑ کی پگڈنڈیوں پر گوٹے اور کناری اور لچکے کی جھالریں ہی جھالریں پھیل جاتی تھیں۔ اور سڑکوں پر چلتی ہوئی بسوں کے ڈرائیور منہ اٹھا کر ان ڈوگریوں کے نظارے میں اتنے محو ہو جاتے کہ بسیں گرنے سے بال بال بچتی تھیں۔

ہماری بس بھی کئی بار کھڈ میں گرتے گرتے بچی۔ آغا صاحب تو بڑے خوش تھے' کیونکہ ہر بار پارسی لڑکی خوف سے چیخ مار کر ان کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ لیکن ان کی بیگم نے ڈرائیور کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک سخت تادیبی تقریر کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو ایک ایسی طویل اور پیچیدہ گالی دی کہ اس فن میں مشاق ہونے کے باوجود وہ ہکا بکا رہ گیا' اور شرم سے اس کے کان سرخ ہو گئے۔

"ہماری خانم دراصل ملکہ دشنام ہیں۔" آغا صاحب نے پنڈت مسافر کو مخاطب کر کے سب مسافروں کو مطلع کیا۔ "بڑے بڑے مہاراجے اور نواب اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ ایک بار سری مہاراج بہادر نے چشمہ شاہی پر گالی گلوچ کا بڑا شاندار ٹورنامنٹ منعقد کیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ' مہاراجہ الور' نواب آف پالن پور' مہارانا جھالا دار سب موجود تھے۔ گالیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ سب نے اپنے اپنے کمال کے جوہر دکھائے لیکن ٹرافی ہماری خانم نے ہی جیتی۔"

کشمیری پنڈت پروفیسر نے گھگیا گھگیا کر اپنے گلے سے کچھ آوازیں برآمد کر کے حسب توفیق داد دی۔

"جانتے ہو' خانم کی گالی کتنی طویل تھی؟" آغا صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا۔

پنڈت صاحب خوشامدانہ حیرت و استعجاب سے جبڑے لٹکا کر بیٹھ گئے جیسے بکری کا میمنہ گھاس وصول کرنے کے لیے تھوتھنی کھولتا ہے۔

"خانم کی گالی ڈیڑھ منٹ دراز تھی' پوری ڈیڑھ منٹ۔" آغا صاحب نے اعلان فرمایا۔

For more books visit www.4Urdu.com

پنڈت جی ایک بار پھر تانہ حقے کی طرح گڑگڑائے۔ اور آغا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فن دشنام طرازی کے حق میں ایک عالمانہ تقریر جھاڑنے کے لیے پر تولنے لگے۔ لیکن ڈرائیور نے انہیں مہلت نہ دی۔ اودھم پور آ گیا۔ اور بس لاریوں کے اڈے پر جا کر رکی۔

URDU4U.COM

اودھم پور کے اڈے پر بڑی ریل پیل تھی۔ بس رکتے ہی پولیس کے کچھ سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ سری نگر میں ہیضہ کی وبا پھوٹی ہوئی ہے۔ اس لیے انا کولیشن سرٹیفکیٹ حاصل کئے بغیر کوئی شخص آگے سفر نہیں کر سکتا۔

اودھم پور کی فرض شناس میونسپلٹی نے انا کولیشن کا بندوبست بھی اڈے ہی پر کر رکھا تھا۔ ایک کھلی جگہ ایک چھولداری نصب تھی جس کے باہر بورڈ پر جلی حروف میں یہ تحریر تھا۔

"خوش آمدید ------- جی آیاں نوں
ہیضے کا ٹیکہ یہاں مفت لگوایئے
از طرف خادم سیاحاں
میونسپل کمیٹی اودھم پور"

اندر ٹیکہ لگانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ البتہ ایک بابو بہت سے خالی فارم اور ہیلتھ آفیسر کی مہر لیے ضرور بیٹھا تھا۔ ہر مسافر سے وہ تین روپیہ نذرانہ وصول کرتا تھا اور فارم پر کر کے اور ان پر مہر لگا کے ان کے حوالے کرتا تھا۔ باہر ایک روپیہ پولیس والا لیتا تھا۔ آٹھ آنے کلینر مانگتا تھا۔ اور اس طرح ساڑھے چار روپے میں وبائے ہیضہ کا انسداد کرنے کے بعد مسافر کو بس میں دوبارہ داخلہ نصیب ہو جاتا تھا۔ ہم اس سعادت سے محروم رہے کیونکہ ہم تو پلیگ سے بچنے کے لیے جموں سے نکلے تھے' ہیضے میں مبتلا ہونے کے لیے سری نگر نہیں جا رہے تھے۔ اس لیے ہم بس سے اتر گئے اور اگلے روز ایک دوسری لاری سے جموں واپس لوٹ آئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

• چمکور صاحب

جموں میں پلیگ' سری نگر میں کالرا ------- اب ہماری جائے پناہ چمکور صاحب تجویز ہوئی۔ جموں توی کے ریلوے اسٹیشن سے ہم ٹرین میں سوار ہوئے تو ریل کا یہ پہلا سفر مجھے بڑا افسانوی محسوس ہوا۔ ریل چھوٹتے ہی میں کھڑکی سے باہر منہ نکال کر بیٹھ گیا اور گرد و پیش کے عجیب و غریب ماحول کو دیکھنے لگا۔ نزدیک کے کھمبے برق رفتاری سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دور کے درخت بڑے آرام سے ہمارے ساتھ ساتھ آگے کی طرف رواں تھے۔ وسطی کائنات ساکت و جامد تھی۔ کچھ دیر کے بعد پہیوں کی گڑگڑاہٹ میں تال اور سر کے ساتھ طبلوں کی تھاپ بجنے لگی۔ اور انجن کی بھپا بھک' چھکا چھک میں بھی موسیقی کی بہت سی دھنیں سما گئیں۔ ریل کی پٹڑی میں جب کوئی موڑ آتا تھا' تو ٹرین ربڑ کے سانپ کی طرح بل کھا کر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ ایک موٹر پر میں ٹرین میں لگے ہوئے ڈبوں کی تعداد گن رہا تھا کہ شاں شاں' شوں شوں کر کے انجن نے بڑے زور سے دھواں چھوڑا اور کوئلے کا ایک ذرہ میری آنکھ میں پڑ گیا۔ معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری پلکوں کے اندر دیا سلائی رگڑ کے جلا دی ہو۔ آنکھیں مل مل کر میرا برا حال ہو گیا۔ اور دائیں آنکھ بوٹی کی طرح سرخ ہو کر سوج گئی۔ سزا کے طور پر مجھے کھڑکی والی سیٹ سے اٹھا کر کمپارٹمنٹ کے درمیان ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا گیا۔

چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے تھے۔ ٹرین رکتی تھی۔ گارڈ سبز جھنڈی ہلاتا تھا۔ انجن سیٹی بجاتا تھا۔ اور گاڑی پھر روانہ ہو جاتی تھی۔ پلیٹ فارموں پر بڑی چہل پہل تھی۔ قلی اور مسافر بد حواسی سے ادھر ادھر بھاگتے تھے۔ چھابڑیوں اور خوانچے والے بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے تھے۔ "ہندو پانی" ------- "مسلمان پانی" ------- گرم پوری' گوشت روٹی' لیمن برف -------

For more books visit www.4Urdu.com

میں دور ہی دور بیٹھا اس رونق کو بصد حسرت و یاس دیکھتا رہا۔ اور دل میں عزم بالجزم کر لیا کہ جب کبھی میں اکیلا سفر کروں گا تو ہر بڑے اسٹیشن پر اتر کے کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤں گا۔ چلتی ہوئی گاڑی سے لپک کر پلیٹ فارم پر اترا کروں گا۔ اور جب ٹرین پھر حرکت میں آ جائے گی تو چھلانگ لگا کر دوبارہ اس میں سوار ہوا کروں گا۔ گارڈ کے رعب داب نے بھی میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس کے ایک ادنیٰ سے اشارے کے سامنے گاڑی کا دیوہیکل انجن بالکل بے بس تھا۔ سفید وردی' سفید ٹوپی' سرخ اور سبز جھنڈیاں' منہ میں وسل..... گارڈ کی آن بان مجھے خوب بھائی۔ اور میں نے جموں کی ہری ٹاکیز میں گیٹ کیپری کا ارادہ ترک کر کے ریلوے گارڈ بننا اپنا زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

لدھیانہ گزر کر غروب آفتاب کے بعد دوراہا کا چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ یہاں پر گاڑی صرف نصف منٹ کے قریب رکتی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی سامان باہر پھینکا اور خود بھی کود کود کر نیچے اترے۔ پلیٹ فارم پر ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ روشنی' نہ قلی' نہ کوئی سواری۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے بڑی مشکل سے نہر سرہند کے گھاٹ پر پہنچے۔ جو اسٹیشن سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ چمکور صاحب سے ہوتی ہوئی روپڑ جانے والی کشتی تیار کھڑی تھی۔ کشتی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ملاحوں نے کسی مسافر کی پھیلی ہوئی ٹانگیں سکیڑیں' کسی کے بازو بھینچے' کسی کا بچہ اٹھا کر اس کی گود میں ڈالا اور ہمیں بھی ٹھونس ٹھانس کر کشتی میں ایسے فٹ کر دیا جس طرح بوری میں فالتو آٹا دبا دبا کر بھرا جاتا ہے۔

آدھی رات کے قریب ملاحوں نے ہر مسافر سے دو دو آنے "چراغی" وصول کی۔ ایک دھندلی سی لالٹین جلا کر ایک بانس سے لٹکا دی اور کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ ہمارا سفر پانی کے بہاؤ کے خلاف تھا اس لیے ایک موٹا سا لمبا سا رسہ لے کر اس کا ایک سرا کشتی سے بندھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر دو بیل جتے ہوئے تھے۔ ایک ملاح سمدار لاٹھی

For more books visit www.4Urdu.com

کاندھے پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں سرکنڈے کی مشعل جلائے بیلوں کو ہانکتا ہوا کنارے کنارے چل رہا تھا۔

کشتی کو کئی جگہ روک روک کر اس کے تلے میں بھرا ہوا پانی نکالا گیا۔ بہلول پور پہنچ کر بیلوں کی جوڑی تبدیل ہوئی۔ جب پو پھٹی تو صبح کی زر کار کرنوں میں نہر کے کنارے دور تک ایک طویل قطار نظر آئی جیسے لوہے اور پیتل کی گاگروں کو الٹ کر زمین پر رکھا ہوا ہو۔ جب نزدیک پہنچ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ گاگریں نہ تھیں بلکہ سکھوں کی قطار تھی جو نہر کی طرف پشت کئے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے اور سر جھکا کر بڑے خضوع و خشوع سے بر سر عام رفع حاجت فرما رہے تھے۔

جب کشتی ان کے قریب پہنچی تو چند سکھ جوان ہماری طرف منہ کر کے ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے اور منہ سے بکرے بلا بلا کر بڑے فخر سے اپنے پوشیدہ علم الابدان کی تشریح کرنے لگے۔ کشتی میں سوار عورتوں نے اپنے چہرے دوپٹوں سے ڈھانپ لیے اور مرد کھانس کھانس کر ایک دوسرے سے کھسیانی کھسیانی باتیں کرنے لگے۔ ملاح صاحب مسلمان تھے۔ ایک نوجوان کو جو تاؤ آیا تو اس نے بھی اپنا تہبند اٹھا کر سکھوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن عمر رسیدہ ملاح نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے بٹھا دیا۔ جب کشتی ان کے سامنے سے گزر گئی تو سکھ جوان بھی نہر کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گئے اور از سر نو فطرت سے ہمکلامی میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کے قریب کشتی چمکور صاحب پہنچ گئی۔ دادی اماں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اپنے پلو سے کھول کر کچھ لڈو کھانے کو دیئے۔ ان کی عمر کوئی ایک سو چار برس کے قریب تھی۔ دانت مضبوط تھے۔ نظر تیز تھی۔ اور چلنے میں وہ ہم سے بھی زیادہ سبک رفتار تھیں۔

دادی اماں کے قدیمی ملازم کرم بخش نے ہمارا سامان اٹھایا۔ وہ بھی ستر برس سے اوپر تھا۔ چھدری داڑھی کے بال ایسے موٹے موٹے تھے جیسے چہرے سے رسیاں لٹک رہی ہوں۔ سامان کے بوجھ تلے بھی اسے پسینہ تک نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دیسی جوتے لوہے کے

For more books visit www.4Urdu.com

کھرپے کی طرح سخت تھے۔ اس نے جوتے کھول کر میرے حوالے کر دیئے' اور آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں یوں خراماں خراماں چلنے لگا جیسے سرسبز گھاس پر چہل قدمی کر رہا ہو۔ کرم بخش کے پاؤں کا تلہ نری کے جوت کے تلے سے بھی زیادہ سخت اور مضبوط تھا۔ وہ کھجور اور کیکر کے بکھرے ہوئے کانٹوں پر بے تکلف برہنہ پا چلتا پھرتا رہتا تھا۔ شدید سردیوں کے زمانے میں اکثر اس کے پاؤں کی ایڑیوں کی جلد خشک ہو کر پھٹ جایا کرتی تھی۔ کرم بخش فوراً گاؤں کے موچی کے پاس جاتا تھا' اور جس طرح پھٹے ہوئے جوتوں کو گانٹھا جاتا ہے' عین اس طرح اپنی ایڑیوں کی جلد میں بھی خوشی خوشی ٹانکے لگوا کر آیا کرتا تھا۔

چمکور صاحب میں بہت سے گردوارے اور ایک خانقاہ تھی۔ گردواروں میں سب سے اونچا درجہ کلغی والے بادشاہ گرو کے گردوارے کا تھا۔ سکھوں کی روایت کے مطابق پنجاب کے ایک مسلمان صوبیدار نے گرو کے دو کم سن صاحبزادوں کو اس گردوارے کی ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ صاحبزادوں کے نام بابا اجیت سنگھ اور جھجار ہری تھے۔ اب انہی کے نام پر اس گردوارے کے ساتھ بابا اجیت سنگھ جھجار ہری خالصہ ہائی سکول بھی قائم تھا۔

دوسرے گردوارے کا نام دمدمہ صاحب تھا۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے طبل بجایا تھا۔ ایک مقدس مقام کا نام مسوال صاحب تھا۔ یہاں پر ایک گرو صاحب نے اپنے دندان مبارک پر مسواک فرمائی تھی۔ ایک اور پاکیزہ جگہ جھاڑ صاحب کہلاتی تھی۔ یہاں پر کسی گرو صاحب نے غالباً کچھ اور کیا ہو گا۔

چمکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ "بابا صاحبا" تھی۔ بابا صاحبا دراصل شہاب الدین کا عرف عام تھا۔ وہ اپنے زمانے کے صاحب کرامت بزرگ مانے جاتے تھے۔ زہد و عبادت کے علاوہ بابا شہاب الدین اپنے علاقے کے قاضی بھی تھے اور کسب معاش کے لیے نیل کا کاروبار کرتے تھے' بابا صاحب کے صحن میں نیل کے بھرے ہوئے مٹکوں کی قطاریں پڑی رہتی تھیں۔ ایک روز آدھی رات گئے سکھوں کے گرو اچانک بابا صاحب کے احاطے میں آ

For more books visit www.4Urdu.com

گئے۔ گرو صاحب عالم روپوشی میں جان بچاتے پھر رہے تھے۔ کیونکہ ان کے تعاقب میں سرہند کا حاکم فوج کی ایک بھاری جمعیت لے کر نکلا تھا۔

URDU4U.COM

گرو صاحب نے کہا۔ "بابا جی! اگر میں اس جلتی ہوئی بھٹی میں کود جاؤں تو شاید میری روحانیت مجھے آگ کے ضرر سے بچا لے' لیکن سرہند کے مغل حاکم سے بچنے کے لیے انسانی وسیلہ درکار ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی وسیلہ ہو تو بتاؤ۔"

بابا صاحب نے جواب دیا۔ "گرو جی مہاراج' وسیلہ روحانی ہو یا انسانی خدا کے حکم کے بغیر میسر نہیں آتا۔ آپ اللہ کا نام لے کر نیل کے اس مٹکے میں بیٹھ جائیں۔ شاید خدا اسی میں بہتری کرے۔"

گرو صاحب گاڑھے گاڑھے نیل سے بھرے ہوئے ایک مٹکے میں بیٹھ گئے۔ بابا صاحب نے مٹکے کا منہ کپڑے کی جالی سے ڈھانپ دیا۔ سرہند کے حاکم نے اپنی فوج کی مدد سے چمکور صاحب کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گردواروں کے گرنتھیوں اور نہنگ اکالیوں کو زمین پر لٹا لٹا کے خوب پٹوایا۔ بہت سے گھروں کی تلاشی لی۔ گنے کے کھیتوں کو کاٹ کاٹ کے رکھ دیا۔ کچھ سپاہی سلام کرنے کے بہانے بابا شہاب الدین کے ہاں بھی آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بابا صاحب کے گھر کا جائزہ بھی لیا اور مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ راتوں رات مغل فوج اپنی مہم پر آگے بڑھ گئی۔ صبح سویرے بابا صاب نے گرو صاحب کو نیل کے مٹکے سے باہر نکالا' اور لباس تبدیل کرنے کے لیے انہیں نئے کپڑوں کا جوڑا پیش کیا۔

گرو صاحب نے کہا۔ "بابا جی! اب میں کبھی سفید کپڑے نہ پہنوں گا' آج سے نیلا رنگ میرے پنتھ کا رنگ مقرر ہوا۔"

گرو صاحب بابا شہاب الدین کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ چند روز بعد چمکور کے گردواروں کے گرنتھی ایک وفد کی صورت میں بابا صاحب کے پاس آئے۔ انہوں نے بڑے ادب نیاز سے بابا صاحب کی خدمت میں ریشم کی ایک تھیلی پیش کی۔ اس تھیلی میں گرو صاب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فرمان تھا' جس میں سارے سکھ پنتھ کی طرف سے بابا

For more books visit www.4Urdu.com

تقسیم کر دیا جاتا۔ چاولوں کے جو دانے مزار پر پڑے رہ جاتے' ان کو چگنے کے لیے بہت سے کبوتر عام طور پر وہاں جمع رہتے تھے۔ بابا صاحب کے ساتھ کبوتروں کی عقیدت مندی کے متعلق طرح طرح کے قصے بن گئے اور رفتہ رفتہ کبوتروں کو اپنا تقدس حاصل ہو گیا کہ چمکور صاحب کی حدود میں ان کا شکار حرام شمار ہونے لگا۔

جس مقام پر بابا شہاب الدین کا مزار واقع تھا' اس سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان کو "پانڈوانہ" کہتے تھے۔ چمکور کے خوش فہم بڑے بوڑھوں کو اس بات کا یقین تھا' کہ کورو پانڈو کی مہا بھارتی لڑائی اسی میدان میں ہوئی تھی۔ ذرا سا کریدنے پر اس میدان سے طرح طرح کے پرانے سکے اور جنگی ہتھیار مل جاتے تھے۔ یوں بھی تیز بارش کے بعد جگہ جگہ انسانی ڈھانچوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر ہوا تیز ہو تو ان ہڈیوں کی رگڑ سے جا بجا چراغ سے جل اٹھتے تھے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں یہ روشنیاں خاص طور پر مافوق الفطرت سماں باندھ دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ مشہور ہونے لگا کہ یہ روحانی دیے بھی بابا صاحب کی کرامت سے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی رات کے وقت پانڈوانہ کے میدان میں بابا صاحب کی یہ کرامت جگمگاتی تو گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سر ڈھانپ کر کوٹھوں پر چڑھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر بابا صاحب سے برکت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے فرزند بھولے میاں نے نیل کا کاروبار سنبھالا۔ بھولے میاں کا اصلی نام قاسم علی تھا۔ وہ محض دیندار تھے۔ دنیاداری سے قطعی بیگانہ تھے۔ سیدھی سادی' صبر شکر کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے بھی اسی ڈگر پر ثابت قدم رہے لیکن چوتھی پشت میں جا کر چودھری مہتاب دین نے ایک نیا رنگ پکڑا۔ سب سے پہلے انہوں نے گردواروں کے گرنتھیوں سے مل کر زمین کی پیش کش پر حق جمانے کی کوشش کی۔ یہاں سے ناکام ہو کر انہوں نے نیل کا ایک پرانا مٹکا لے کر اسے پھولوں سے خوب سجایا۔ گھر کے صحن میں ایک زرکار

For more books visit www.4Urdu.com

شہاب الدین کو اپنا محسن مانا ہوا تھا اور اس احسان کے بدلے گردواروں کی کچھ زمین بھی دائمی طور پر بابا شہاب الدین اور ان کی اولادوں کے حق میں وقف کر دینے کی پیش کش تھی۔

URDU4U.COM

بابا صاحب نے اس فرمان کی پشت پر گورمکھی زبان میں ایک تحریر لکھ دی جس کا مفہوم یہ تھا۔ "اگر یہ موقع گرو صاحب کے ساتھ جہاد کا ہوتا' تو بخدا شہاب الدین خود اپنے ہاتھ سے ان کا سر قلم کر دیتا۔ لیکن یہ جنگ حاکم اور محکوم کا سیاسی تنازعہ ہے۔ گرو صاحب کے ساتھ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ فقط اپنا اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ اس کی اجرت میرے لیے حلال نہیں۔ زمین کی پیش کش کو میں اپنی آل اولاد پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ البتہ میری خواہش ہے کہ چمکور کی حدود میں سور کا گوشت لانا بند ہو جائے۔ اگر سکھ قوم یہ درخواست مان لے تو یہ اس کی عین عنایت ہو گی۔"

سکھوں نے برضا و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور اس وقت سے چمکور میں سور کے گوشت کی سختی سے ممانعت ہو گئی۔

چند سال بعد جب بابا صاحب کی وفات ہوئی تو دور دور سے ہزاروں ہندو' سکھ اور مسلمان ان کے جنازے میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت مندوں نے اپنے ہاتھ سے بابا صاحب کا مقبرہ تعمیر کیا۔ مقبرہ ایک سادہ سی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ بابا صاحب کی وصیت کے مطابق اس پر چھت نہ ڈالی گئی۔

بابا صاحب کی زندگی میں ہی یہ رسم چل نکلی تھی کہ گاؤں میں آنے یا گاؤں سے جانے والی ہر برات ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتی تھی۔ بابا صاحب کچے چاولوں میں شکر ملا کر ایک ایک مٹھی براتیوں میں بانٹ دیتے تھے۔ ہندو' سکھ' مسلمان سب اس تبرک کو دولہا دلہن کے لیے نیک فال سمجھتے تھے۔ بابا شہاب الدین کی وفات کے بعد اس رسم میں اور بھی شدت آ گئی۔ اب ہر برات بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوتی۔ براتی لوگ کچے چاولوں میں شکر ملا کر مزار پر پھینکتے' اور پھر ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ براتیوں میں

For more books visit www.4Urdu.com

شامیانہ تان کر اس کے نیچے ایک خوبصورت تخت بچھایا۔ اس تخت پر ریشمی تکیوں اور گدوں کے درمیان اس مٹکے کو جما کے رکھ دیا۔ دو خوش پوش نہنگ اکالی ملازم رکھے۔ جو مورچھل پنکھے اٹھائے ہر وقت حاضر رہتے تھے' اور بڑے ادب سے مٹکے پر آہستہ آہستہ پنکھا ہلاتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے چار دانگ عالم میں یہ چرچا کر دیا کہ یہی وہ مقدس مٹکا ہے جس میں بابا شہاب الدین نے گرو صاحب کو چھپا کے رکھا تھا۔ پہلے اکا دکا سکھ مٹکے کی زیارت کے لیے آئے۔ پھر عقیدت مند دیویاں چڑھاوے کے پھول' حلوہ' مٹھائیاں اور پھل لا کر روشن کرنے لگیں۔ چند مہینوں کے بعد جب "سنگھ سبھا" کے موقع پر چمکور میں سکھوں کا سالانہ اجتماع ہوا تو ہزاروں زائرین نے مٹکے کو تعظیم دی۔ چودھری مہتاب دین نے تعظیم دینے کا عملی طریقہ یہ رائج کر رکھا تھا کہ عقیدت مند پہلے ہاتھ جوڑ کر مٹکے کو نمسکار کرتے تھے' پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اسے بصد ادب و احترام چھوتے تھے اور آخر میں چاندی کے روپوں یا سونے کی مہروں کا نذرانہ مٹکے میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی سنگھ سبھا پر ڈیڑھ دو ہزار روپے جمع ہوئے۔ دوسری پر پانچ چھ ہزار۔ اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر ایسا وقت بھی آیا کہ سنگھ سبھا کے روز مٹکا بار بار بھرتا تھا اور بار بار خالی ہوتا تھا۔

پانچ سات برس میں چودھری مہتاب دین ایک معمولی نیل فروش سے ترقی کر کے لکھ پتی رئیس بن گئے۔ چمکور کے ارد گرد انہوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی خرید لی' اور بابا شہاب الدین کے کچے مکان کو مسمار کر کے ایک عالیشان حویلی تعمیر کروا لی۔ جس کے چوبارے کی چھت بلندی میں آس پاس کے گردواروں کے کلس کا مقابلہ کرتی تھی۔ گرنتھیوں کو یہ گستاخی ناگوار گزری۔ یوں بھی کچھ عرصے سے جملہ گرنتھی چودھری مہتاب دین سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ مٹکے کی بڑھتی ہوی مقبولیت نے گردواروں کی آمدنی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور چودھری مہتاب دین کی روز افزوں امارت میں گرنتھیوں کو اپنے حقوق کا خون نظر آ رہا تھا۔ ادھر سکھوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے کہ چودھری مہتاب دین کے چوبارے کی بلندی گردواروں کے کلس سے بہرحال کمتر ہونی

For more books visit www.4Urdu.com

چاہیے۔ ادھر چودھری صاحب نے نہلے پہ دہلا مارا۔ اور اس سازش کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے انہوں نے اپنے چوبارے کی چھت پر سکھ پنتھ کے بیشمار جھنڈے گاڑ دیئے۔ اندر وہی زرکار شامیانہ تان کر تخت پوش بچھایا' اور تخت پوش پر ریشمی گدوں اور گدیلوں کے درمیان نیل کا خالی مٹکا جما کے رکھ دیا۔ اب یہ کمرہ "چوبارہ مٹکا صاحب" کہلانے لگا' اور سکھوں میں دور دور تک شہرت ہو گئی کہ واہ بھئی واہ! چودھری مہتاب دین نے بھی کمال کر دیا۔ اپنے خرچ پر مٹکا صاحب کے لیے ایسا بلند و بالا چوبارہ بنایا ہے' کہ چمکور کے گردواروں کو بھی مات کر دیا۔

ہر سنگھ سبھا کے بعد چودھری مہتاب دین سونے چاندی کے سکوں کو گلا کر سلاخوں میں ڈھال لیتے تھے۔ اور ان سلاخوں کو تانبے کی گاگروں میں بھر کر اپنی حویلی کی اندرونی دیواروں میں خفیہ طور پر گاڑ دیتے تھے۔ اس خزانے کی حفاظت کے لیے چودھری صاحب نے ایک نرالی ترکیب نکالی۔ انہوں نے آٹھ دس قاری اور حافظ جمع کر کے ملازم رکھ لیے۔ اندر کے کمرے میں ہر قاری باری باری دو دو تین گھنٹے بابا شہاب الدین کے لیے قرآن خوانی کرتا تھا۔ ایک دو نوکر ان کی خدمت پر ہمہ وقت مامور رہتے تھے چنانچہ اندرونی کمروں میں چوبیس گھنٹے چراغ جلتا تھا اور قرآن خوانی ہوتی تھی۔ ایک پنتھ دو کاج ------- ہم خرما و ہم ثواب۔ بابا شہاب الدین کی روح کو ایصال و ثواب بھی ہوتا رہتا تھا اور چودھری مہتاب دین کے گڑے ہوئے خزانے کی حفاظت بھی بعنوان شائستہ ہوتی رہتی تھی۔ دن رات قرآن خوانی کی خبر پھیلی تو لوگوں نے فرط حیرت و مسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ واہ بھی واہ! چودھری مہتاب دین کی کیا بات ہے۔ بابا صاحب کی روح پاک کے لیے دن رات چراغ جلاتا اور قرآن شریف پڑھواتا۔ چودھری صاحب نے بھی اپنی سعادت مندی کا مزید ثبوت دینے کے لیے بابا شہاب الدین کے مزار کی مرمت پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ قبر کا تعویذ بیش بہا سنگ مرمر کا بنوایا اور فرش اور دیواروں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے خوشنما شیشے چڑھوا دیئے۔ اب مزار پر ایک چراغ جلتا تھا' فرش اور دیواروں پر اس کے سینکڑوں عکس جگمگا اٹھتے تھے۔ عقیدتمند سرشار ہو

For more books visit www.4Urdu.com

کر جھومتے تھے۔ اور چودھری مہتاب دین کی امارت اور سخاوت کے گن گاتے تھے۔

دین کی طرف سے بے نیاز ہو کر اب چودھری مہتاب دین نے اپنی دولت کا رخ دنیا کی طرف بھی موڑنا شروع کیا۔ حویلی کے بڑے احاطے میں صبح و شام دربار لگا کر بیٹھنے لگے۔ سرخ بانات پر سنہری گوٹ کا شامیانہ لگتا تھا۔ نقرئی پایوں والی زرکار مسند پر چودھری صاحب خود بیٹھتے تھے۔ پیچھے آٹھ دس چوبدار شام دار عصا لیے مستعد کھڑے رہتے تھے۔ دائیں بائیں خوش پوشاک خادم دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ سامنے درباریوں کی نشستیں تھیں۔ درباریوں میں قل اعوذیئے ملاؤں' شرادھ کھانے والے پنڈتوں اور بھنگ کے رسیا نہنگ اکالیوں کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں کو اپنے دربار سے وابستہ رکھنے کے لیے مہتاب دین طرح طرح کے پاپڑ بیلتے تھے۔ مولویوں کے لیے دو وقت پلاؤ' گوشت اور مرغ پکتے تھے۔ پنڈتوں کے لیے پوری کچوری' حلوے اور کھیر کا دور چلتا تھا۔ نہنگ اکالیوں کے لیے بڑے بڑے کونڈوں میں بھنگ بھگوئی جاتی تھی اور بالٹیاں بھر بھر کے تقسیم ہوتی تھی۔ یوں بھی گرد و نوا کے اٹھائی گیرے' رسہ گیر اور نامی گرامی چور اچکے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے ہیں اور چودھری مہتاب دین کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اپنی نوابی کا مکمل ٹھاٹھ جمانے کے لیے چودھری صاحب نے چھ چھ فٹ کے پچاس تنومند گھڑ سواروں کا دستہ بھرتی کیا۔ اور اپنی سواری کے لیے ایک بوڑھا سا ہاتھی بھی کہیں سے خرید لائے۔ اس ہاتھی پر چاندی کا ہودہ لگا کے چمکور کے گلی کوچوں میں ہوا خوری کے لیے نکلا کرتے تھے۔ مضافات میں اپنی زمینداری کا دورہ کرنے کے لیے وہ اور ان کا عملہ رتھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ان رتھوں کے لیے انہوں نے ہریانے کے چاق و چوبند بیلوں کی خوبصورت جوڑیاں پال رکھی تھیں۔ جب بیل رتھوں میں جتتے تھے تو ان پر زر بفت کے جھول ڈالے جاتے تھے۔ گلے میں چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں لٹکتی تھیں اور سینگوں پر سونے کے خول چڑھائے جاتے تھے۔ اپنے بیلوں سے چودھری مہتاب دین کو خاص الفت تھی۔ ہر صبح وہ ان کا چارہ اپنے سامنے ڈلواتے تھے۔ دن میں کئی بار ان پر پھریرا ہوتا

For more books visit www.4Urdu.com

تھا' اور ہر جمعرات کو خالص گھی اور شکر میں مکی کی روٹی کی چوری کوٹ کر انہیں کھلائی جاتی تھی۔ رتھ کھینچنے کے بعد بیلوں کو پانی میں گلاب کا عرق ملا کر پلایا جاتا تھا۔

URDU4U.COM

جوں جوں دولت کی ریل پیل بڑھتی گئی' چودھری مہتاب دین کی دلچسپیاں بھی گھوڑوں' بیلوں اور ہاتھیوں کی دنیا سے نکل کر اپنی جولانیوں کے لیے نئے نئے میدان مارنے لگیں۔ طبیعت میں اقتدار کی ہوس اور دماغ پر امارت کا بھوت سوار تھا۔ ان کی سب سے عزیز خواہش تھی کہ چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس طرف وہ گزر جائیں' لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں' یہ چودھری مہتاب دین کی سواری جا رہی ہے۔ "چوبارہ مٹکا صاحب" کے مالک' راجوں کے یار غار' مہاراجوں کی ناک کے بال چودھری مہتاب دین' جن کے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے سامنے سارے ماجھے میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا۔ لیلائے آرزو کے اس جنون میں چودھری صاحب نے سب سے پہلے روپڑ کے راجہ بھوپ سنگھ کو بڑی خوشامد سے چمکور صاحب تشریف لانے کی دعوت دی۔ بھوپ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے روپڑ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا۔ دریائے ستلج کے کنارے اس چھوٹے سے شہر کی اہمیت ابتدا میں صرف اتنی تھی کہ یہاں سے پٹیالہ' جنید اور نابھہ کے راجواڑوں پر نظر احتساب رکھنا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کا دام اقتدار پھیلتا پھیلتا دریائے ستلج تک پہنچ گیا' اور انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے اب روپڑ کو بڑا اہم مقام حاصل ہو گیا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ کے ساتھ' اور رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ اس نے ساز باز کا کچھ ایسا جال بنا کہ دونوں بھوپ سنگھ کو اپنا جگری دوست ماننے لگے اور سازشوں کے اس الجھاؤ میں بھوپ سنگھ رفتہ رفتہ روپڑ کا خود مختار حکمران سا ہو گیا۔ لاہور کا دربار اور انگریزوں کے ایجنٹ راجہ بھوپ سنگھ کو منہ مانگی رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔ جنہیں وہ شراب' کباب اور عورت پر بے دریغ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر کبھی یہ رقمیں وصول ہونے میں تاخیر ہو جاتی' تو بھوپ سنگھ

For more books visit www.4Urdu.com

کے سپاہی روپڑ کے گرد و نواح میں نکل جاتے تھے۔ اور دن دیہاڑے ڈاکے ڈال کے سونا چاندی اور غلہ کے علاوہ گائے' بھینسوں' گھوڑوں اور جوان عورتوں کو بھی ایک ہی لاٹھی سے ہانک لاتے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ عرصہ سے چودھری مہتاب دین کی دن دگنی رات چوگنی امارت کے چرچے سن رہا تھا۔ اسے وہ طلسماتی مٹکا دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ جو سال میں کئی بار دولت کے انبار اگلتا تھا۔ اس کے علاوہ چمکور صاحب کے مقدس گردواروں کی زیارت بھی ایک بہانہ تھی۔ چنانچہ جب بھوپ سنگھ کو چودھری مہتاب دین کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بسر و چشم قبول کر لیا۔ یہ خبر سن کر چودھری صاحب کا سر وفور مسرت سے چکرانے لگا۔ اور انہوں نے فوراً بابا شہاب الدین کے مزار پر حاضر ہو کر دو نفل شکرانہ ادا کئے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی خاطر تواضع اور استقبال کے لیے چودھری مہتاب دین نے جس پیمانے پر انتظامات شروع کئے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ سارے گاؤں کے در و دیوار پر چودھری صاحب نے اپنی جیب سے سفیدی پھروائی۔ گلی کوچوں میں حلوان بچھایا۔ بچوں کو نیلے اور سبز ریشم کی وردیاں سلوا کے دیں۔ وہ رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر صبح و شام جلوس نکالتے تھے اور نعرے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ ہر مشق کے بعد انہیں دودھ جلیبی اور موتی چور کے لڈو بانٹے جاتے تھے۔ پانڈوانہ کے میدان میں راجہ بھوپ سنگھ کے سواروں اور سپاہیوں کے لیے خیموں اور شامیانوں کی قطاریں ایستادہ ہو گئیں جن میں سینکڑوں مشعلوں' شمعوں اور فانوسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرد بٹھانے کے لیے بیسیوں سقے صبح شام چاروں طرف چھڑکاؤ کرتے تھے۔ چھڑکاؤ کے پانی میں عرق گلاب کی بوتلیں بڑی فیاضی سے ملائی جاتی تھیں۔

چودھری مہتاب دین کی حویلی کے مردانے میں راجہ بھوپ سنگھ کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مہمان خانے کی دیواروں پر ابرق ڈال کر سفیدی کرائی گئی تھی۔ دروازوں پر زری اور کمخواب کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ اور فضا کو ہر لحظہ معطر رکھنے کے لیے کئی

For more books visit www.4Urdu.com

ملازم عطر کی پچکاریاں اٹھائے مستعد کھڑے رہتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ کو چمکور صاحب میں صرف ایک دن اور ایک رات قیام کرنا تھا۔ ان کی آمد سے ایک ہفتہ قبل راجہ صاحب کے کچھ افسر انتظامات کا جائزہ لینے تشریف لائے۔ انہوں نے تقریباً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ مین میکھ نکالی۔ اور راجہ صاحب کے قیام کو آرادم دہ بنانے کے لیے چودھری مہتاب دین کو بہت سے مفید مشوروں سے نوازا۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ راجہ بھوپ سنگھ کے لیے اعلیٰ درجہ کی شراب کثیر مقدار میں موجود ہو۔ شراب کے ساتھ کباب بھی لازمی ہیں' لیکن گوشت حلال نہ ہو' خالص جھٹکا ہو۔ شراب اور کباب کے بعد راجہ صاحب صرف سور کا گوشت نوش فرماتے ہیں۔ سور جوان اور فربہ ہوں اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجہ کے ناچ گانے کی محفل برپا ہو' تو چودھری صاحب کے ذوق میزبانی پر راجہ صاحب کی خوشنودی کی مہر ثبت ہونا امر یقینی ہے۔

یہ ہدایات سن کر چودھری مہتاب دین ایک لحظہ کے لیے سکتے میں آ گئے۔ ان کی رگوں میں بابا شہاب الدین رحمتہ اللہ علیہ کے خون کا جو حصہ تھا' اس نے دم بھر کے لیے جوش مارا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سونے چاندی سے بھری ہوئی گاگروں کا خوش آئند تصور خون کے جوش پر غالب آ گیا۔ اور جاہ و جلال کی شہرت نے موروثی توہمات کے تانے بانے ادھیڑ کر پھینک دیئے۔ چودھری صاحب نے اپنا خاص رتھ دو خوش سلیقہ مصاحبوں کے ساتھ انبالہ کی طرف بھگایا تا کہ یکتائے روزگار موسیقار جھمکا جان اور جگا چودھری کی مشہور عالم رقاصہ ترنجن بائی کو جس قیمت پر ہو سکے اپنے ساتھ لوا لائیں۔ دونوں کے ساتھ تین تین ہزار روپیہ نقد' ایک ایک جڑاؤ گلوبند اور دو دو شاہانہ جوڑوں پر معاملہ طے ہوا۔ اور پانڈوانہ کے میدان میں ان کے طائفوں کے لیے کئی ایک اور خیمے بھی نصب ہو گئے۔

شراب کے لیے چودھری صاحب نے اپنے گماشتے لدھیانہ روانہ کئے۔ وہاں پر انگریزوں کا پولٹیکل ایجنٹ کرنل ویڈ تھا۔ وہ ریشہ دوانیوں کے علاوہ در پردہ انگریزی شراب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے آدمی اس سے منہ مانگی قیمت پر اعلیٰ درجہ

For more books visit www.4Urdu.com

کی ولایتی شراب کی تین چار پیٹیاں خرید لائے۔

فربہ اور جوان سور فراہم کرنے کے لیے چودھری صاحب کو البتہ قدرے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے وہ گردواروں کے گرنتھیوں کے پاس گئے کہ وہ اپنی وساطت سے منہ مانگے داموں پر چند ایک اچھے سور منگوا دیں۔ لیکن سکھ گرنتھیوں اور پاٹھیوں نے واہگورو' واہگورو کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہم بابا شہاب الدین کے ساتھ اپنے عہد کو توڑنے کے روا دار نہیں ہیں۔ ہر چند چودھری مہتاب دین نے انہیں یقین دلایا کہ عہد نامہ کی شکست و ریخت کا وبال خود ان کی اپنی گردن پر ہو گا' لیکن گردوارہ دمدمہ صاحب کے بوڑھے گرنتھی گیانی کھڑک سنگھ نے انہیں سختی سے ڈانٹ دیا۔ "چودھری مہتاب دین' تم اپنے آپ کو کس کھیت کی مولی سمجھتے ہو؟ آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کو تمہارا نام بھی یاد نہ رہے گا۔ لیکن بابا شہاب الدین کا دربار اور سکھ دھرم تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے معاہدہ کو ہاتھ لگانے والے ہم تم کون؟

چودھری صاحب کا بس چلتا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گیانی کھڑک سنگھ کا منہ نوچ لیتے۔ لیکن راجہ بھوپ سنگھ کی آمد کے موقع پر سکھوں سے لڑائی جھگڑا مول لینا قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ چودھری مہتاب دین خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور دل ہی دل میں کڑھتے اور جملہ سکھ پنتھ کو گالیاں دیتے واپس لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے کوئی درجن بھر چماروں کو جمع کیا۔ اور انہیں توڑے دار بندوقوں اور تیز دھار بلموں سے مسلح کر کے بیلے کے جنگلوں میں بھیج دیا کہ وہ تنومند اور جواں سال سوروں کا شکار کر کے لائیں۔

خدا خدا کر کے آخر وہ روز سعید بھی آ پہنچا جس کے انتظار میں چودھری مہتاب دین بیقراری سے گھڑیاں گن رہے تھے۔ راجہ بھوپ سنگھ اپنے جنگی رتھ پر سوار چمکور صاحب تشریف لائے۔ ان کے جلو میں ہاتھیوں' گھوڑوں' شکاری کتوں اور فوجی سپاہیوں کا لاؤ لشکر تھا۔ جب یہ جلوس چمکور صاحب کی حدود میں داخل ہوا' چودھری صاحب کے بیسیوں ملازم پھولوں کے ٹوکرے اٹھائے دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں جہاں سے یہ قافلہ گزرتا گیا' یہ لوگ گلاب' چنبیلی اور گیندے کے پھول رتھ کے راستے میں بچھاتے جاتے تھے۔ چھوٹے

For more books visit www.4Urdu.com

چھوٹے بچے رنگ برنگی جھنڈیاں لہراتے تھے اور گلی گلی میں باوردی بینڈ سکھوں کے مشہور ترانے بجا بجا کر سلامی دیتے تھے۔

راجہ بھوپ سنگھ نے پہلے سارے گردواروں کی زیارت کی۔ پھر وہ بابا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اور اس کے بعد انہوں نے چوبارہ مٹکا صاحب جا کر اس طلسماتی مٹکے کو تعظیم دی' جس کے بطن میں سونا چاندی بڑی افراط سے پیدا ہوتا تھا۔ راجہ بھوپ سنگھ نے نیلے زر بفت کا سرپوش اٹھا کر مٹکے کے اندر للچائی ہوئی نظروں سے جھانکا جو آج خاص طور پر سونے چاندی کے سکوں اور زیورات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ چودھری مہتاب دین نے لپک کر مٹکا انڈیل دیا' اور راجہ بھوپ سنگھ کے قدموں میں یہ زریں انبار لگا کر بڑی لجاجت سے عرض کیا۔ "فقیر کا یہ حقیر نذرانہ قبول ہو۔"

راجہ بھوپ سنگھ کے خاص مصاحبوں نے یہ سارا انبار سمیٹ کر بڑے بڑے رومالوں میں باندھ لیا۔ راجہ صاحب نے اظہار خوشنودی کے لیے مٹکا صاحب کو دوبارہ تعظیم دی۔ انگریزی شراب کی بوتلیں راجہ صاحب کو خاص طور پر پسند آئیں۔ سر شام پانڈوانہ کے میدان میں بڑے بڑے سوروں کی کھالیں اترنے لگیں۔ اور رات گئے جب جھمکا جان اور ترنجن بائی کے طائفے اپنا اپنا ساز و سامان سجا کر محفل میں جم گئے' تو یکایک چمکور کے ہندو' مسلمان اور سکھ بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی کنڈیاں چڑھا کر اندر دبک کر بیٹھ گئے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آج پہلی مرتبہ چمکور میں بر سر عام سور کا گوشت کاٹا گیا تھا۔ آج تک اس قصبہ کی فضا جھمکا جان کے طبلے کی تھاپ اور ترنجن بائی کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے نا آشنا تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں جب ان سازوں کی آواز فضا میں دور دور تک لہرائی تھی تو گاؤں والوں کے دل دھک دھک کرنے لگے تھے۔ خوش عقیدہ عورتیں جو ہر جمعرات کو بابا صاحبا کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں' سہم سہم کر کوٹھوں کی منڈیر سے لگی بیٹھی تھیں۔ طوفان زدہ اندھیری راتوں میں وہ ان ہی کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کے ان مقدس چراغوں سے اپنی مرادیں مانگا کرتی تھیں جو بابا صاحب کے فیض سے پانڈوانہ کے میدان میں روشن ہوا کرتے تھے۔ آج اسی میدان میں رنگ

For more books visit www.4Urdu.com

و بو کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ قندیلوں اور شمعوں کی ضیا تا حد نظر جگمگا رہی تھی۔ لیکن شراب میں بد مست فوجیوں کی ہر بنکار کے ساتھ گاؤں والیوں کے دل لرزنے لگے تھے' جیسے کوئی زبردستی ان کی بانہیں پکڑ کر کھینچ رہا ہو۔ بے زبان کنواریاں جو سپنوں کی بارات لے کر بابا صاحبا کے مزار پر کچے چاول اور شکر کی مٹھیاں بھر بھر کر نچھاور کیا کرتی تھیں' یوں حیران پریشان تھیں جیسے بھرے ہوئے چوراہے پر بر سر عام ان کا سہاگ لٹ رہا ہو۔ سارا گاؤں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح انجانی فضاؤں میں ڈگمگا رہا تھا۔ روایات کی ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ ثبات کا پیچ کٹ گیا تھا۔ سکون کی دولت لٹ گئی تھی۔ تاریخ کے سانچے بے نور ہو گئے تھے۔ وقت کا پاسبان سو گیا تھا۔ صدیوں کے سکوت کو فقط ایک رات کے شور نے نگل لیا تھا۔

دوسری صبح نور کے تڑکے جب راجہ بھوپ سنگھ اور اس کا لاؤ لشکر رخصت ہو کر چلا گیا تو چمکور صاحب کی صورت یوں نکل آئی جیسے ہزاروں گھوڑوں نے کسی خوبصورت قبرستان کو پاؤں تلے روند ڈالا ہو' تھکے ہارے کارندے اور خادم جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئے۔ اندر حویلی میں چودھری مہتاب دین بھی ایک تخت پوش پر لیٹے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ایک دو خاص مصاحب ان کا سر اور پاؤں دبا رہے تھے۔ کئی روز کے پے در پے رت جگے نے انہیں چور کر دیا تھا۔ یوں بھی کل رات سے وہ کچھ زیادہ ہی کسل مند تھے۔ رقص و نغمہ کی محفل میں راجہ بھوپ سنگھ نے انہیں کئی بار شراب پینے کی دعوت دی تھی' لیکن چودھری صاحب ہر بار خوش سلیقہ حیلوں بہانوں سے ٹالتے گئے۔ انجام کار جب راجہ صاحب خود لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور شراب کا جام بہ نفس نفیس ان کے ہونٹوں سے لگا کر کھڑے ہو گئے تو چودھری مہتاب دین کی مروت انکار کی تاب نہ لا سکی۔ دوسرا جام انہوں نے جھکا جان کر ہاتھ سے پیا۔ تیسرا ترنجن بائی سے۔ اولین بادہ گساری کے اس دور نے چودھری مہتاب دین کے دل و دماغ میں ایسے ایسے رنگین قمقمے روشن کر دیئے جن کی تجلیوں سے وہ آج تک روشناس نہ ہوئے تھے۔ حویلی

For more books visit www.4Urdu.com

کے در و دیوار ایک خوبصورت غبار میں ڈوب گئے۔ جھکا جان کے گلے سے آواز کی جگہ مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ترنجن بائی کے تھرکتے ہوئے تن بدن میں سونے اور چاندی کے تار لہرانے لگے۔ رنگ و نور کے اس سیلاب میں چودھری مہتاب دین غبارے کی طرح اڑ رہے تھے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ٹوٹتا ہوا خمار چودھری صاحب کے رگ و پے میں ٹیسیں مارنے لگا۔ وہ اپنے تخت پوش پر اوندھے پڑے کراہ رہے تھے۔ اس عالم میں سردار نونہال سنگھ نے انہیں ایک مژدۂ جانفزا سنایا۔

سردار نونہال سنگھ "چوبارہ مٹکا صاحب" کی سیوا پر مامور تھے۔ اور اس روحانی کاروبار میں چودھری مہتاب دین کے دست راست تھے۔

سردار نونہال سنگھ نے چودھری صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چودھری اٹھو' اس طرح حاملہ عورت کی طرح پڑے پڑے کب تک کراہتے رہو گے؟"

چودھری صاحب اپنا دکھتا ہوا بدن سنبھال کر تخت پوش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

چودھری' ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے۔" سردار نونہال سنگھ نے کہا۔ "شراب کا کسل بھی شراب ہی سے جائے گا۔"

سردار نونہال سنگھ کے اصرار پر چودھری مہتاب دین نے شراب کے ایک دو گھونٹ پیئے تو ان کے کسیلے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ زبان پر تراوت آ گئی۔ گلا کھل گیا اور جسم کے دکھتے ہوئے جوڑوں پر از سر نو نشاط عود کر آیا۔ زندگی کے کیف کا یہ تیر بہدف نسخہ چودھری صاحب کو بہت پسند آیا۔ انگریزی شراب کی بچی کھچی بوتلیں جو ٹوکرا بھر کر باہر بھجوائی جا رہی تھیں' انہوں نے واپس منگوا لیں اور اپنے دیوان خانے کی الماری میں احتیاط سے رکھ کر تالا لگا دیا۔

شام کے وقت جب چودھری مہتاب دین ہاتھی پر بیٹھ کر حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے' تو انہیں اپنے گاؤں کا ماحول کچھ پرایا پرایا سا لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو کلکاریاں مار کر ہاتھی کی سونڈ سے لٹک جاتے تھے اور ہاتھی انہیں اٹھا اٹھا کر چودھری مہتاب دین کی گود میں ڈال دیتا تھا' آج کہیں نظر نہ آئے۔ وہ نوخیز اور شریر لڑکیاں بھی غائب

For more books visit www.4Urdu.com

تھیں جو چودھری کا راستہ روک کر چاندی کے کنگنوں اور سونے کی بالیوں کی فرمائش کیا کرتی تھیں۔ آج کسی نے سر راہ اس کے ساتھ ہلکا پھلکا مذاق نہ کیا۔ وہ سارا گاؤں گھوم آیا' لیکن کسی کوٹھے کی چھت سے دعاؤں کی آواز نہ آئی کہ "او بابا صاحبا کے خوش بخت وارث' اللہ تجھے سدا ہی سکھی رکھے۔" اس بے کیف سیر کے بعد جب چودھری صاحب گھر آئے' محجوب اور شرمندہ سے تھے۔ لیکن سردار نونہال سنگھ نے شراب کی بوتل کھول کر سامنے رکھ دی۔ دو تین پیگ پی کر چودھری صاحب پھر چہک اٹھے۔ چمکور کی سنسان گلیاں جادو کے زور سے پھر آباد ہو گئیں' خاموش کوٹھوں پر خوبصورت پریوں کے جھرمٹ ناچنے لگے۔ آسمان پر قوس قزح چھا گئی۔

راجہ بھوپ سنگھ نے خوش ہو کر چودھری مہتاب دین کو اپنے ہاتھ سے کئی خط لکھ کر دیئے۔ کچھ پروانے کلکتہ میں بڑے بڑے انگریزوں کے نام تھے' جن میں چودھری صاحب کو "وفا شعار حکومت انگلشیہ اور معاون دولت برطانیہ" کے خطابات سے نوازا گیا تھا اور بڑے وثوق سے یہ تصدیق کی گئی تھی کہ راجہ بھوپ سنگھ کے بعد ستلج کے اس پار انگریزوں کا سب سے بڑا بہی خواہ چودھری مہتاب دین ہی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ کی دوسری سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کے نام تھی۔ اس میں چودھری مہتاب دین کو سکھ پنتھ کی آنکھ کا تارا اور خالصہ حکومت کا راج دلارا ثابت کر کے یہ سرٹیفکیٹ دیا تھا کہ ستلج کے اس پار راجہ بھوپ سنگھ لاہور دربار کی تلوار اور چودھری مہتاب دین مہاراجہ ادھیر راج کی ڈھال ہے۔ سری اکال پورکھ نے ان دو وفادار سپوتوں کو پیدا کر کے خالصہ دربار کو ستلج پار کی سرحد سے بالکل بے فکر کر دیا ہے۔ راجہ بھوپ سنگھ واہگورو جی کا خالصہ اور چودھری مہتاب دین واہگورو جی کی فتح ہے۔

چودھری مہتاب دین نے ان نایاب پروانوں کے لیے ریشم کی تہہ در تہہ تھیلیاں سلوائیں۔ دن میں کئی بار وہ ان تھیلیوں کو نسلی بٹیروں کی طرح ہاتھ میں لے کر کبھی سہلاتے تھے' کبھی مٹھیاتے تھے۔ رات کے وقت چسکی لگا کر وہ تھیلیوں کو بڑے اہتمام سے کھولتے

For more books visit www.4Urdu.com

اور خطوں کو ادب و احترام کے ساتھ سر آنکھوں سے لگاتے اور جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے۔ بادامی کاغذ کے یہ پرزے چودھری صاحب کے ذہن میں جل پریوں کی طرح ناچتے' اور ان کا ایک ایک حرف الہامی پھوار کی طرح ان کی روح کے ریگزاروں پر رنگ برنگ ترشح کرتا۔ لاہور اور کلکتہ کے شاہی درباروں کا تصور ان کے دل و دماغ میں پھلجڑیاں سی چھوڑتا' اور خیالوں کے اس گل و گلزار میں چمکور کی بستی بڑی ذلیل اور بے معنی نظر آتی۔ یہاں کے لوگ طوطا چشم تھے جو چودھری مہتاب دین سے کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ انہوں نے کسی کو قتل نہ کیا تھا۔ کسی کے ہاں ڈاکہ نہ ڈالا تھا۔ کسی عورت کی آبرو نہ لوٹی تھی۔ اس کے برعکس وہ تو لوگوں کی مدد ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے تو اس گاؤں کا سر بلند کر دیا تھا۔ چودھری مہتاب دین کے طفیل آج دور دور تک چمکور کا ڈنکا بجتا تھا۔ لیکن یہاں کے کمینے لوگ اپنی عظمت کے اس احساس سے بے بہرہ تھے۔

دن بہ دن مغائرت کے ایک ٹھوس دیوار چودھری صاحب کے گردا گرد اٹھتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ ایک کوڑھی کی طرح سب سے کٹ کر الگ تھلگ پڑے رہ گئے۔ صبح کی سیر بند ہو گئی' شام کو ہاتھی کی سواری بھی موقوف ہو گئی۔ دن بھر وہ اپنی حویلی میں بند رہتے تھے' تا کہ گاؤں والوں سے مڈبھیڑ نہ ہو جو آنکھیں چار ہوتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ ماحول کی اس پاگل کر دینے والی بیگانگی سے گھبرا کر چودھری مہتاب دین نے رخت سفر باندھا اور ایک ہاتھی' تین رتھ' پچاس سوار اور بہت سے پیادوں کی جمعیت لے کر انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔

جب چودھری مہتاب دین کی سواری روانہ ہوئی تو گویا طاعون کا چوہا گاؤں سے نکل گیا۔ لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ بچوں نے از سر نو حویلی کے میدان میں گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دیا اور جوان لڑکیوں نے حسب معمول کوٹھوں پر بیٹھ کر بابا صاحبا کے دوہے گانا شروع کر دیئے جن میں آئینہ عشق تو عشق الٰہی کا ہوتا تھا لیکن عکس نوخیز مٹیاروں کے آرزو انگیز سپنوں نئی دلہنوں کے متلاطم ولولوں اور

For more books visit www.4Urdu.com

منتظر سہاگنوں کی آس کا پڑتا تھا۔

یہاں تک آ کر دادی اماں کی سینہ بہ سینہ روایات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔ چودھری مہتاب دین کہاں گئے؟ ان کا انجام کیا ہوا؟ -------- دادی اماں کوئی بات وثوق سے نہ بتا سکتی تھیں۔ ایک افواہ یہ تھ کہ کلکتہ کی راہ میں کوسی ندی کے کنارے ان کی ملاقات ایک مجذوب سائیں ریتا شاہ سے ہو گئی جو ریت کی مٹھیاں بھر بھر کر منہ میں ڈالتے تھے اور اسے باداموں کی طرح چباتے رہتے تھے۔ چودھری مہتاب دین نے اپنے لاؤ لشکر کو خیر باد کہا' اور قلندرانہ وضع اختیار کر کے ریتا شاہ کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ بنارس کے شہر میں صبح بنارس کی سیر دیکھتے دیکھتے وہ ایک برہمنی پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ جو گنگا میں اشنان کرنے کے بعد سورج دیوتا کو جل چڑھا رہی تھی۔ اس عاشقی میں انہوں نے چار ابرو کا صفایا کروا دیا' اور ایک ہندو سوامی کا چیلا بن کر جوگ لے لیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ہمارے بڑے بوڑھوں نے اپنی انا کی حفاظت کے لیے یہ مفروضہ پال رکھا تھا کہ یہ سب پاپڑ بیلنے کے بعد چودھری صاحب لاہور داتا کے دربار میں گوشہ نشین ہو گئے اور چند سال بعد سکھوں کے خلاف کسی معرکے میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ چنانچہ دادی اماں اپنی چادر کا پلو پھیلا کر بڑی عقیدت سے دعا مانگا کرتی تھیں۔ "اللہ چودھری مہتاب دین کو قدم قدم پر جنت نصیب کرے۔ وہ دین اور دنیا دونوں سے سرخرو ہو کر اگلے جہان سدھارا۔"

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ چودھری مہتاب دین میدان جہاد میں شہید ہوئے تھے۔ یا سائیں ریتا شاہ کے قدموں میں فوت ہوئے تھے یا بنارس کی ہندو برہمنی کے جوگ میں سورگباش ہو گئے تھے۔ میرے دل و دماغ پر تو ان کے سیماب کی طرح مضطرب کردار کی بوقلمونی نے ایسی گرت جما لی تھی جیسے بڑے سائز کا مقناطیس چٹکی بھر لوہ چون کو اپنی کشش میں جکڑ لیتا ہے۔ میرے ذہن سے ہری ٹا کیز جموں کی گیٹ کیپری اور ریلوے ٹرین کا گارڈ بننے کے خیالات کافور کی طرح اڑ گئے۔ اور چودھری مہتاب دین کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو نے مجھے مگر مچھ کی طرح غڑاپ سے نگل لیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

عجیب و غریب خواہشات کی اس دلدل سے مجھے کرم بخش نے نکالا۔

کرم بخش بچپن ہی سے دادی اماں کا ملازم تھا۔ اب اس کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔
URDU4U.COM
لیکن وہ دن رات تنومند بیل کی طرح بے تکام کام کرتا تھا۔ اس کا تن بدن خار دار کیکر کی طرح سخت اور کرخت تھا۔ لیکن دل بڑا گداز تھا۔ کہنے کو تو وہ بالکل ان پڑھ اور جاہل تھا لیکن یوسف زلیخا کے قصے کی کتاب ہاتھ میں الٹی پکڑ کر وہ صحیح ترتیب سے ساری نظم کے اشعار فر فر سنا دیتا تھا۔ اگر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی جائے تو اس کی زبان پر نظم کی روانی بھی وہیں رک جاتی تھی۔ وہ خود بھی پنجابی میں بیت کہتا تھا۔ کبھی کبھی چودھری مہتاب دین کے قصے سنا کر جب دادی اماں عجیب سی لے میں بابا شہاب الدین کے گورمکھی دوہے الاپنے لگتی تھیں تو کرم بخش بھی پاس بیٹھ کر ہمیں ان کا مطلب سمجھایا کرتا تھا' اور کہیں کہیں بابا صاحب کے کلام اور بیان میں حسب ضرورت اصلاح بھی دیتا رہتا تھا۔ بابا شہاب الدین صاحب کے دوہوں کا رنگ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا۔

"او میرے یار' میں نے آج تک تیرے باغ میں قدم نہیں رکھا
میں کیا جانوں تیرے پھول پیلے ہیں یا سرخ ہیں یا سفید ہیں؟
جو تیرا رنگ ہو وہی میرا رنگ ہے
میں تو تیرے باغ میں آنکھوں کے بل جاؤں گی"

"او میرے یار' تیرے دامن کو میں نے کبھی نہیں چھوا
تیرا دامن بادلوں سے پرے ستاروں سے اونچا ہے
میں بچاری تو کبھی تیرے خیال کے دامن کو بھی نہ چھو سکی
تیرا خیال تجھ سے بھی زیادہ تابناک ہے
کیونکہ اس کو میں خود اپنے ہاتھوں سے سجاتی ہوں"

For more books visit www.4Urdu.com

"او میرے یار' رات کی خلوت میں میں نے تجھ کو لمحہ بھر کے لیے آخر پا ہی لیا
اب میری سہیلیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ یہ محض خواب تھا
URDU4U.COM
ایسے خواب پر ہزاروں بیداریاں قربان
میں تو اسی کے انتظار میں پڑی سوتی ہوں"

"او میرے یار' میں بھی تو تیرے بہت کام آتی ہوں
دیکھ میں نے تیرے رخ پر اپنے تصور کا حجاب ڈال رکھا ہے
اگر میں اپنے تصور کی آنکھ ذرا سی بھی بند کر لوں
تو ساری دنیا تجھے بے نقاب دیکھ لے گی"

"او میرے یار' تو احد ہے' تو صمد ہے
تو ابد ہے' تو ازل ہے
شکر کر تو میری گلی کا البیلا جوان نہیں
ورنہ میں تجھے خوب ستاتی' خوب ترساتی' خوب تڑپاتی
تجھے بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالتی
اور سارا سارا دن اپنے دروازے کی اوٹ سے جھانک جھانک کر تیرا تماشا دیکھا کرتی"

"او میرے یار' تو عزیز ہے' تو حفیظ ہے
تو کریم ہے' تو حلیم ہے
شکر کر تو میرے سینے کا ارمان نہیں
ورنہ اگر میرا سینہ پھٹ جاتا پھر بھی تو نکل نہ سکتا"

"او میرے یار' تو وہاب ہے' تو ستار ہے
تو تو اب ہے' تو غفار ہے

For more books visit www.4Urdu.com

شکر کر تو ہمارے کھیتوں کا راکھا نہیں
ورنہ میں ہر روز تجھے چوری چوری ملنے آیا کرتی
تو رکھوالی کر ہی نہ سکتا
سارے کھیت کو چڑیاں چگ جاتیں"

URDU4U.COM

"او میرے یار، تو معبود ہے، تو مسجود ہے
تو مقصود ہے، تو موجود ہے
شکر کر تو میں نہیں
ورنہ نہ جانے تیرا کیا حال ہوتا!"

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

ہی یہ حکم بھی سنایا۔ "اگلے سال ورنیکلولر فائنل کا امتحان دینا ہو گا۔ اگر وظیفہ نہ لیا تو کان پکڑ کر سکول سے نکال دوں گا۔"

پہلے روز جب میں اپنی جماعت میں گیا' تو نیا کرتہ' کورے لٹھے کا نیا کھرڑ کھرڑ کرتا ہوا پاجامہ اور پھندنے والی سرخ رومی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر بہت سے ہندو اور سکھ لڑک منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجانے لگے اور زور زور سے گال پھلا پھلا کر بکرے بلانے لگے۔ ایک لڑکے نے رومی ٹوپی کا پھندنا نوچ کر توڑ لیا اور اسے برش کی طرح اپنے گالوں پر پھیرنے لگا۔ دوسرے نے دھول جما کر ٹوپی کو پچکا دیا۔ تیسرا ٹھوکریں مار مار کر میری پینٹ لیدر کی کالی گرگابی کو مسلنے لگا۔ کئی سکھ لڑکے میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور لہک لہک کر بھانت بھانت کے آوازے کسنے لگے۔

فوجاں شہروں آئیاں ہیں؟

فوجاں گٹ مٹ کر دی ہیں؟

فوجاں پڑھائی کریں گی؟

فوجاں بابو بنیں گی؟

فوجاں ٹوپی لیتی ہیں؟

فوجاں مسلے ہوتی ہیں؟

ان پے در پے سوالات کے بعد انہوں نے گھونسے تان تان کر ہوا میں گھمائے اور بیک آواز زور زور سے گانے لگے۔ "راج کرو گا خالصہ -------- باقی رہے نہ کو"

اتنے میں کوئی پکارا کہ ماسٹر جی آ رہے ہیں۔ سب لڑکے فوراً شرافت سے اپنے اپنے ڈیسک پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

ماسٹر منگل سنگھ اردو اور ریاضی کے استاد تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور رومی ٹوپی کی جگہ پگڑی باندھ کر سکول آنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے تھوڑی

For more books visit www.4Urdu.com

- راج کرو گا خالصہ' باقی رہے نہ کو

دادی اماں اور کرم بخش مجھے بی اے ایس جے ایچ خالصہ ہائی سکول میں داخل کروانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ سکول کا پورا نام بابا اجیت سنگھ ججھار ہری خالصہ ہائی سکول تھا اور گرو کے دو صاحبزادوں کے نام پر قائم کیا گیا تھا جنہیں سکھوں کی فرض روایات کے مطابق مسلمان حاکموں نے ایک ملحقہ گردوارے کی دیواروں میں زندہ گڑوا دیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ نے رجسٹر میں میرا نام درج کرنے کے بعد دادی اماں سے پوچھا۔

"تائی' بچے کی عمر دس سال لکھ دوں؟"

دادی اماں کو سارا گاؤں تائی کہا کرتا تھا۔

"پھوٹ تیرا فٹے منہ" دادی اماں نے ہیڈ ماسٹر کو ڈانٹا۔ "تو اندھا ہو گیا ہے' تجھے دکھائی نہیں دیتا؟ میرا پوتا پندرہ برس سے ایک دن کم نہیں۔"

دادی اماں کے نزدیک بچوں کی عمر زیادہ جتانا باعث افتخار تھا۔ اس سے تعلیم بھی جلد ختم ہو جاتی تھی اور نوکری بھی جلد ملنے کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

اس مسئلہ پر ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ اور دادی اماں کے درمیان بحثا بحثی ہونے لگی' تو کرم بخش نے نجومی کی طرح زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر زائچہ بنایا اور ثالث بن کر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ "ماسٹر جی! اس کی عمر تیرہ سال تین مہینے تین دن لکھ دو۔"

ہیڈ ماسٹر نے جز بز ہو کر اٹکل پچو سے رجسٹر میں میری عمر کا اندراج کر دیا اور قبلہ والد صاحب کی وہ ڈائریاں دھری کی دھری رہ گئیں' جن میں انہوں نے ہر بچے کی پیدائش کی ساعت' دن' مہینہ اور سال عیسوی' ہجری اور بکرمی حساب سے الگ الگ نوٹ کی ہوئی تھیں۔

عمر کے حساب سے ہیڈ ماسٹر نے مجھے دو سال آگے کی کلاس میں داخل کر لیا' اور ساتھ

For more books visit www.4Urdu.com

دیر سبق پڑھایا اور زیادہ دیر بہت سے لڑکوں کی بری طرح پٹائی کی۔
فارسی کے پیریڈ میں پنڈت سری رام نے بھی یہی عمل دہرایا۔ پنڈت جگن ناتھ انگریزی پڑھاتے تھے اور مارنے پیٹنے کی جگہ فقط کان مروڑنے پر اکتفا کرتے تھے۔ البتہ تاریخ اور جغرافیہ کا سبق سکون سے ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ماسٹر تارا سنگھ نہ کبھی ہنستے تھے' نہ مسکراتے تھے' نہ مارتے تھے۔
سکول کا اصلی ہوا ماسٹر منگل سنگھ ہی تھے۔ اردو پڑھانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اردو کا سبق وہ ٹھیٹھ پنجابی زبان میں دیا کرتے تھے اور اشعار کی تشریح کرنے میں ان کا اپنا ہی نرالا انداز تھا۔ ایک بار غالب کا یہ شعر آیا۔

سادگی و پرکاری' بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

اس شعر کو انہوں نے ہمیں یوں سمجھایا۔
"سادگی تے اسدے نال پرکاری' بے خودی تے اسدے نال نال ہشیاری۔ حسن نوں تغافل دے وچ کیا پایا؟ شاعر کہندا اے اس نے حسن توں تغافل دے وچ جرات آزما پایا۔ لئی اینی جئی گل سی۔ غالب شعر بناندا بناندا مر گیا۔ میں شعر سمجھاندے سمجھاندے مر جانا اے۔ تہاڈے کوڑھ مغزاں دے پلے ککھ نہیں پینا۔ اگے چلو۔"
اردو کے علاوہ ماسٹر منگل سنگھ علم ریاضی میں بھی کامل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سوالات حل کرتے وقت جمع' تفریق' تقسیم کی جگہ وہ طلباء پر ضرب کا عمل زیادہ بروئے کار لاتے تھے۔ حقیقتاً ان کو اصلی شرح صدر صرف زد و کوب کے فن میں حاصل تھا۔ ذرا سی بھول چوک پر وہ قصاب کی طرح طالب علم پر لپکتے تھے۔ اسے گردن سے دبوچ کر ہوا میں اچھالتے تھے اور پھر اس پر لاتوں' مکوں اور تھپڑوں کی ایسی تابڑ توڑ بارش برساتے تھے کہ دیکھنے والوں کو بھی دن میں تارے نظر آنے لگتے تھے۔ ہر روز ایسی

For more books visit www.4Urdu.com

دو دو تین تین پٹائیاں دیکھ کر سکول کا ایک ایک لمحہ میرے لیے سوہان روح بن گیا۔ ہر وقت سر پر خوف کی ننگی تلوار لٹکتی رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت اس مار پیٹ کا قرعہ فال اچانک میرے نام نکل آئے۔ یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور سر سے پاؤں تک پسینہ چھوٹنے لگتا تھا۔

URDU4U.COM

ایک روز میں تیار ہو کر سکول جانے کو تھا' کہ گھر میں کسی کو زور سے چھینک آئی۔ دادی اماں نے چھینکنے والے کو بری طرح کوسا اور مجھے واپس بلا کر بٹھا لیا۔ کیونکہ کام پر روانگی کے وقت کسی کا چھینک دینا بد شگونی کی علامت تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد مجھے دوبارہ سکول سدھارنے کی اجازت ملی لیکن اس بد شگونی نے میرے پاؤں من من کے بھاری کر دیئے۔ میرے دل کو یقین سا ہو گیا کہ آج کا دن ہی وہ روز موعود ہے جب ماسٹر منگل سنگھ کے ہاتھوں میری پٹائی کی باری آنے والی ہے۔ اس خوف کا بھوت میرے سر پر کچھ ایسی شدت سے سوار ہو گیا کہ میں نے سکول جانے کی بجائے سیدھا نہر کی راہ لی۔ نہر سرہند کے کنارے بیریوں کے جنگل تھے' آموں کے باغ تھے اور کھجوروں کے جھنڈ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں بڑے مزے سے بیر چننے' کچی امبیاں اور کھجوریں کھانے میں مصروف تھا کہ ایک جگہ اچانک کرم بخش سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ مویشیوں کے لیے چارہ لانے شاملات دیسہ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بھاگ کر کچھ جھنڈوں میں روپوش ہونے کی کوشش کی تو اس نے لپک کر میرا ٹیٹوا لیا۔ مجبوراً میں نے بڑی دردناکی سے سکول کی ساری رام کہانی اسے سنا دی۔

"اب مدرسے نہیں جاؤ گے؟" کرم بخش نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جاؤں گا۔" میں نے شد و مد سے جواب دیا۔

"ہاں جی ہاں" کرم بخش بولا۔ "کتابوں میں کیا رکھا ہے؟ عیش کی زندگی تو میری طرح گھاس کھودنے میں ہے۔ بچو' آؤ آج تمہیں یہ کرتب بھی سکھا دوں۔"

میں خوش خوش کرم بخش کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ بڑے آرام سے برہنہ پا چلا جا رہا تھا۔ تیز تیز نوکیلی سولوں والے کھجور کے سوکھے ہوئے ڈھوڈے جا بجا اس کے پاؤں تلے آتے

For more books visit www.4Urdu.com

تھے اور چرمر چرمر کر کے ٹوٹ جاتے تھے۔ اس کی ایڑیوں میں کئی جگہ بڑے بڑے شگاف تھے۔ ہر سال سردیوں میں وہ قصبہ کے موچی کے پاس جاتا تھا اور جس طرح دوسرے لوگ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے مرمت کرواتے تھے کرم بخش کھڑے کھڑے اپنی ایڑیوں کی پھٹی ہوئی کھال سلوا لیتا تھا۔

شاملات دیہہ میں کئی جگہ گھٹنے گھٹنے تک گھاس لہلہا رہی تھی۔ ایک مقام پر کرم بخش نے تیز تیز ہاتھ مار کر لمبی گھاس درانتی سے کاٹنے اور چھوٹی گھاس کھرپے سے کھودنے کا گر مجھے سکھایا اور حکم دیا۔ "جلدی جلدی گھاس کی ایک پنڈ کھود لو۔ ڈنگر بھوکے کھڑے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

میں درانتی اور کھرپا لے کر شروع کرنے والا تھا کہ کرم بخس نے پکار کر کچھ اور ہدایات دیں۔ بچھو اور کنکھجورا نظر آئے تو خبردار کھرپا اور درانتی خراب نہ کرنا۔ انہیں پاؤں سے مسل کر مار ڈالنا۔ سانپ سنپولیا' بجو یا سنکھ پوٹ ملے تو فوراً مجھے ہاک مارنا۔ میں اجیپھا (وظیفہ) پڑھ کر انہیں پکڑ لوں گا۔"

سانپ سے تو خیر میں واقف تھا لیکن باقی نام میرے لیے اجنبی تھے۔ بجو کے متعلق کرم بخس نے اطلاع دی کہ مہین مہین آنکھوں والا بڑا ہوشیار جانور ہے' اور قبروں سے تازہ مردے نکال کر اکڑوں بٹھا لینا یا کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے ساتھ ساتھ چلا لینا اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ سنکھ پوٹ انسان کی گدی پر بیٹھ کر اپنے پنجے پیچ کس کی طرح اس کی کھوپڑی میں گاڑتا ہے اور چونچ سے ٹھونگیں مار مار کر تازہ بھیجا کھانے کا بڑا شوقین ہے۔

کرم بخش تو ایک درخت کے سائے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کمر سے ہزار منکوں والی تسبیح کھول کر وظیفہ کرنے لگا لیکن میری ہمت کے بادبان کی ساری ہوا ٹھس سے نکل گئی۔ ایک تو مجھ سے گھاس ہی نہ کٹتی تھی' دوسرے قدم قدم پر عجیب و غریب حشرات الارض کا خوف میرے دل پر ہتھوڑے مارتا تھا۔ ایک دو جگہ سوراخوں میں سانپ کی کیچلی پھنسی ہوئی نظر آئی تو میں بھاگ کھڑا ہوا' اور کرم بخش کے پاس آ کر

For more books visit www.4Urdu.com

بڑی عاجزی سے ہتھیار ڈال دیئے۔

"اچھا اچھا' گھاس تو میں کھود ہی لوں گا۔ تم کل سے سکول جاؤ گے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے جازم جواب دیا۔

کرم بخش چمک کر اٹھا۔ پہلوانوں کی طرح اس نے مجھے کلاوے میں لے کر ہتکٹی لگائی اور پھر پالٹ مار کر منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ اس نے ایک پاؤں میری گردن پر رکھا اور دوسری ایڑی سے میری کمر پر پے در پے ضرب لگانے لگا۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا لیکن تابکئے؟ آخر سکول کے بارے میں بھی میں نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

"توبہ کرو اور ناک سے زمین پر سات لکیریں کھینچو۔" کرم بخش نے حکم دیا۔

میں نے حکم کی تعمیل کر دی۔

"قسم کھاؤ کہ دوبارہ سکول سے نہیں بھاگو گے۔" کرم بخش نے دوسرا حکم دیا۔

میں نے فوراً قسم کھا لی۔

اس فرض منصبی سے فارغ ہو کر کرم بخش نے گھاس کھودی اور پھر آرام سے بیٹھ کر زمین میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تین تین چار چار انچ گہرے دو سوراخ کھودے۔ میں سمجھا کہ شاید اب ہم اخروٹ یا بنٹے کھیلیں گے لیکن اس نے بڑی چابکدستی سے زیر زمین ٹنل سی کھود کر دونوں سوراخوں کو آپس میں ملا دیا۔ ایک سوراخ میں اس نے کوئی چیز ایسی ٹھونسی جیسے پائپ میں تمباکو بھرا جاتا ہے۔ دوسرے سوراخ میں اپنے ہونٹ فٹ کر کے وہ منہ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور سرکنڈا جلا کر پہلے سوراخ پر رکھ دیا۔ کرم بخش نے زور زور سے دو چار سوٹے مارے' آگ کا شعلہ سا لپکا اور پھر وہ پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ پر سر ٹکا کر غٹ کے سو گیا۔ گانجے کے اس عمل کے دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب وہ جاگا تو خوب چست تھا۔

واپسی پر کرم بخش گلہری کی طرح ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اور پکی ہوئی رسیلی کھجوروں کا ایک گچھا مجھے کھانے کو دیا۔ ساتھ ہی وعدہ کیا کہ آج کی بات وہ گھر

For more books visit www.4Urdu.com

میں کسی کو نہ بتائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی قسم توڑ دی اور پھر سکول نہ گیا۔ البتہ کرم بخش کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے نہر پر جانے کی بجائے گگا ماڑی چلا گیا۔ گگا ماڑی ایک کچا کوٹھا تھا جو گاؤں سے دو ڈھائی میل باہر ایک لق و دق ریتلے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر چکی کے پاٹ کی طرح ایک گول چبوترہ تھا۔ مسلمان اسے گگا پیر کی قبر سمجھ کر یہاں فاتحہ درود پڑھتے تھے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ گگا سائیں کی سادھی تھی کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق گگا ایک ہندو پرم ہنس تھا اور مرنے کے بعد اس کی راکھ پر یہ سادھی بنائی گئی تھی۔ چوہڑے چمار اسے اپنا روحانی پیشوا مان کر طرح طرح کی پوجا پاٹ اور جادو ٹونا کیا کرتے تھے۔ علاقے کے ہیجڑے بھی یہاں جمع ہو کر "گدھے" کی محفل جماتے تھے اور عقیدت مندی سے گاتے اور ناچتے تھے۔

گگا ماڑی کے اندر کچھ لوگ اپنے اپنے طریقے سے گگا پیر کو خراج عقیدت پیش کرنے میں مصروف تھے۔ باہر دو کالے بھجنگ آدمی لنگوٹ باندھے اور گلے میں بڑے بڑے ڈھول لٹکائے دم دھناتی دھکم دھیا' دھکم دھیا کی تال پر زور زور سے ڈھول بجا رہے تھے۔

ان کے گرد چار پانچ آدمی بڑے والہانہ طور پر "حال" کھیل رہے تھے۔ کبھی وہ پنجے اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر لٹو کی طرح گھومتے تھے' کبھی زمین پر چار زانو بیٹھ کر مینڈک کی طرح پھدکتے تھے' کبھی سر کے بل کھڑے ہو کر ڈھول والوں کے گرد تیز تیز بیضوی دائرے کاٹتے تھے۔ ان میں ایک شخص جو سب سے زیادہ سرمستی کے عالم میں حال کھیل رہا تھا' وہ کرم بخش تھا۔

کرم بخش کی آنکھوں میں لال لال انگارے چمک رہے تھے۔ اس کی داڑھی کے موٹے موٹے بال غضبناک خار پشت کے کانٹوں کی طرح چہرے پر ایستادہ تھے۔ اس کا انگ انگ یوں تھرک رہا تھا جیسے جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں پھڑک پھڑک کر تڑپتی ہیں۔

منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر کرم بخش نے میری گردن ناپی اور ڈھول والوں سے کچھ دور تپتی ہوئی ریت پر کان پکڑوا کر میرا مرغا بنا دیا ایک لڑکے کو اس نے میری چوکیداری

For more books visit www.4Urdu.com

پر مامور کیا اور خود حال کھیلنے والوں کے حلقے میں شامل ہو گیا۔

دھوپ میں کان پکڑے پکڑے میرے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ ڈھول کی ہر دھمک میرے دل و دماغ پر توپ کے گولے کی طرح برس رہی تھی۔ اگر کوئی اکا دکا راہگیر آپس میں بات چیت کرتے ہوئے قریب سے گزرتے تھے تو ان کی آواز میرے کان میں دیر تک یوں گونجتی رہتی تھی جیسے بہت سے کتے اندھے کنویں مل کر لگا تار رو رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس حالت میں ایک گھنٹہ گزر گیا یا ایک سال نکلا یا ایک صدی بیت گئی۔ کیونکہ جب "حال" سے فارغ ہو کر کرم بخش نے مجھے کان چھوڑنے کا مژدہ سنایا تو میری کمر پیر فرتوت کی طرح خمیدہ ہو چکی تھی' اور مجھ سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کرم بخش نے پیچھے سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنا گھٹنا زور سے پیٹھ میں مار کر میری کمر سیدھی کی۔ پھر اس نے حکم دیا کہ زمین پر ناک سے اکیس لکیریں نکال کر توبہ کروں۔

میں نے تپتی ہوئی ریت پر ناک سے اکیس لکیریں نکال دیں۔

"قسم کھاؤ کہ اب پڑھائی سے نہ بھاگو گے۔" کرم بخش کڑکا۔

میں نے بخوشی اللہ کی قسم کھا لی۔

"رسول کی قسم کھاؤ۔" کریم بخش نے کہا۔

میں نے بلا تکلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم بھی کھا لی۔

"قرآن کی قسم کھاؤ۔"

میں نے اس کی بھی تعمیل کر دی۔

"اب اپنی جان کی قسم بھی کھاؤ۔" کرم بخش نے حکم لگایا۔

یہ قسم کھانے سے میں ہچکچا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان اللہ اور رسول اور قرآن شریف سے بہرحال زیادہ عزیز تھی۔ کرم بخش نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور میرے منہ پر زناٹے سے ایسا کرارا تھپڑ مارا کہ میرے سر میں بھڑوں کے بے شمار چھتے بھنبھنا اٹھے۔ دوسرا

For more books visit www.4Urdu.com

تھپڑ لگنے سے پہلے میں نے کرم بخش کا حکم مان لیا اور اپنی جان کی قسم بھی کھا لی۔

جان کی قسم توڑنے کے ہولناک نتائج کا کرم بخش نے کچھ ایسا بے سروپا اور بے ربط سا نقشہ کھینچا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آنے لگی۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں مجھے ہچکی لگ گئی اور گلے سے رندھی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے بیل کے گلے میں تربوز کا چھلکا پھنس جاتا ہے۔ کرم بخش سمجھا کہ خوف و ہراس سے میری گھگھی بندھ گئی ہے۔

اس تاثر کو مزید کمک پہنچانے کے لیے میں نے اپنے بدن پر مصنوعی کپکپی طاری کی اور کچھ تیز تیز جھرجھریاں بھی لیں۔ کرم بخش خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ اور اس کی انا کی تسکین گرم گرم بھاپ کی طرح اس کے کانوں' ماتھے اور گالوں اور ناک پر چھا گئی۔

کرم بخش کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے کہا۔ "چاچا تمہارے پاس تو کوئی جادو ہے۔ میں سکول سے بھاگ کر جدھر جاتا ہوں' تم بھی وہاں آ جاتے ہو۔"

کرم بخش نے اصیل مرغ کی طرح فخریہ چھاتی پھلائی اور دو دن کی لے کر کہنے لگا۔

"جادو ٹونا تو پلید کافروں کا کرتب ہے۔ کرم بخش کے پاس تو رب سچے کا اجیھپا ہے۔ تم دلی جاؤ یا دکھن چلے جاؤ' کرم بخش کا ہاتھ تیری گردن پر اسے جا پڑے گا جیسے مرغی کھنگار پر گرتی ہے۔"

کرم بخش کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے کہا۔ "چاچا' تمہارے وظیفے نے تو بڑے بڑے معرکے مارے ہوں گے۔"

"اسپغول تے کچھ نہ پھرول" کرم بخش نے محاورتاً کہا کہ ڈھکی چھپی بات کو زیادہ نہ کریدو۔

"چاچا' وظیفے نے کچھ نہ کچھ تو رنگ لگایا ہو گا۔" میں نے خوشامدانہ اصرار کیا۔

"رہے نام رب سچے دا۔" کرم بخش نے سینہ تان کر کہا۔ "کوئی رنگ جیسا رنگ لگایا ہے؟ بیٹ' بیلے' بار سب جگہ کرم بخش ہی کرم بخش کا نام گونجتا تھا۔ بڑے بڑے

For more books visit www.4Urdu.com

جٹا دھاری مہنت' بھان متی کے جوگی اور گیانی تیرے چاچا کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔"

جوش میں آ کر کرم بخش نے اپنے وظیفے کی کرامات کی محیر العقول داستانوں کا تانتا باندھ دیا۔ بھوت پریت چڑیل' چھلاوہ' چھلیڈا' وڈاوا سے مقابلہ کرنا' جن اتارنا اور لوٹے میں سر بمہر کر کے جلا ڈالنا۔ آوہ' پزآوا' دودھ' مکھن باندھنا اور کھولنا۔ حب اور بغض کے فلیتے جلانا۔ مقہوری احدا کے لیے ہنڈیا چھوڑنا' بلان جلانا۔ آٹے کی پتلیوں میں سوئیاں گاڑ کر دشمنوں کو ایذا پہنچانا۔ سانپ' بچھو اور بھڑ کے کاٹے اور آدھا سیسی درد کو جھاڑنا' داڑھ نکالنا' چور پکڑنے کے لیے لوٹا گھمانا' مجبوری کی حالت میں بقدر ضرورت دست غیب حاصل کرنا۔ یہ سب کرم بخش کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اس کے جس کمال نے میرے ذہن پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ تسخیر محبوب کا عمل تھا۔ بھرے میلے میں بڑی بڑی صاحب حسن و جمال چاٹنیاں اپنے بانکے چھبیلے جوانوں کو چھوڑ کر اس پھٹی ہوئی ایڑیوں اور پیلے دانتوں والے کریہہ المنظر بڈھے کے پیچھے یوں لگ جاتی تھیں جیسے مکھیاں گڑ سے چپک جاتی ہیں۔ کرم بخش کچھ دیر انہیں اپنی ڈور کے ساتھ لگائے گھومتا پھرتا' اور پھر انہیں مٹھائی کے لیے کچھ پیسے دے کر رخصت کر دیتا تھا۔

"تیرے چاچے پر وجود کا عیش حرام ہے۔" کرم بخش نے دبی دبی حیرت سے مجھے بتایا۔

"اسی لیے تو مرشد نے شادی کی اجازت نہیں دی۔"

مجھے اس برہمچاری بڈھے کی حماقت پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا۔ لیکن بظاہر میں نے اس کی اتنی تعریف کی کہ وہ خوش ہو کر مجھے ماگھی بنئے کی دکان پر جلیبیاں کھلانے لے گیا۔ ماگھی رام چمکور صاحب کا واحد حلوائی تھا۔ وہ سارا دن لنگوٹ باندھے بڑے بڑے کڑاہوں میں جلیبیاں تلتا تھا یا موتی چور کے لڈو بناتا تھا۔ جنہیں سکھ جاٹ شرطیں بد بد کر سیروں کے حساب سے وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر جاتے تھے۔ ماگھی رام کا بوڑھا باپ ایک میلی سی دھوتی باندھے اور سر پر ڈھیلی ڈھالی پگڑی ٹکائے اکڑوں بیٹھا بھٹی جھونکتا رہتا تھا۔ اس کا چہرا پکے ہوئے اناس کی طرح پیلی پیلی' گلابی گلابی' گدری

For more books visit www.4Urdu.com

گدری جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور مہین مہین چندھائی ہوئی آنکھوں پر لانبی لانبی سفید بھویں ایسے لٹکتی تھیں جیسے اس نے ماتھے پر ململ کی جھالر ٹانک رکھی ہو۔

URDU4U.COM

دونوں باپ بیٹا کرم بخش کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

"واہ بھئی واہ' کرم بخشا" ماگھی رام بولا۔ "پرماتما کی کرپا سے تو خود ہی آ گیا۔ میں تو تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔

ماگھی بنئے نے چہک چہک کر ہمیں بتایا کہ پانچ روپے ڈال کر اس نے بازار مائی سیواں امرتسر میں لاٹری کا ٹکٹ لیا تھا۔ لاٹری اس کے نام نکل آئی ہے۔ مال بھی چل پڑا ہے اور آج ہی کشتی سے چمکور پہنچ رہا ہے۔

"کرم بخشا" ماگھی رام نے کہا۔ "تو گڈا (بیل گاڑی) جوڑ کے فٹا فٹ گھاٹ پر پہنچ جا۔ کشتی آتے ہی مال چھڑا کر دکان پر لانا ہے۔ ایک سیر پختہ لڈو تجھے دوں گا۔ آدھ سیر گڑ بیلوں کے لیے ملے گا۔"

"واہ جی واہ" کرم بخش نے ناراضگی سے جواب دیا۔ "کرم بخش تیرے باپ کا نوکر جو ہوا' ادھر تو نے حکم دیا ادھر میں گڈا لے کر نہر پر پہنچا۔ لالہ' کبھی تو نے شیشے میں اپنی صورت بھی دیکھی ہے؟"

"چلو چار آنے نقد بھی لے لینا۔" ماگھی رام نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔ "اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے بھلا؟"

"ہزاروں کا مال مفت آ رہا ہے اور کرم بخش کو چونی پر ٹرخاتے ہو؟ لالہ' تم بڑے ندیدے ہو۔" کرم بخش نے کہا۔

دفعتہ ماگھی رام کے بڈھے باپ نے بھی اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کرم بخش کو غصے سے گھور کر بولا۔ "ہزاروں کا مال کون سالا بکتا ہے' بڑی لاٹری کا ٹکٹ تھا کوئی مخول نہیں۔ لاکھ سے کم کا مال نکلے تو میں پیشاب سے داڑھی منڈوا دوں گا۔"

کچھ مزید چق چق بق بق کے بعد بیل گاڑی کی اجرت طے ہو گئی۔ ایک روپیہ نقد' دو

For more books visit www.4Urdu.com

سیر مٹھائی' بیلوں کے لیے ایک سیر گڑ۔ بیعانہ کے طور پر کرم بخش نے آدھ سیر جلیبیاں پیشگی تلوا لیں' اور ہم مزے مزے سے جلیبیاں ٹھونگتے کھلیان پہنچے۔ کرم بخش نے بیل گاڑی تیار کی اور تھوڑی دیر میں ہم نہر پر کشتی گھاٹ پہنچ گئے۔ ماگھی رام اور اس کا باپ کا پہلے سے آئے بیٹھے تھے اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوراہے سے آنے والی کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔

خدا خدا کر کے کشتی آئی اور ماگھی رام نے اپنے مال کی بلٹی چھڑائی۔ یہ مال لکڑی کی تین پیٹیوں پر مشتمل تھا' جن پر لوہے کی پتی چڑھا کر میخوں کے ساتھ ٹھونکا ہوا تھا۔ کسی پیٹی کا وزن ڈیڑھ دو من سے کم نہ تھا۔

بیل گاڑی میں ماگھی رام اور اس کا باپ ایک ایک پیٹی پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ تیسری پیٹی پر میں چڑھنے لگا' تو انہوں نے ڈانٹ کر منع کر دیا۔ کیونکہ میرے وزن سے ان کے مال و متاع کے آبگینوں کو لحوق ضرر کا احتمال تھا۔ راستہ بھر باپ بیٹا امید کے عجیب و غریب دشت و دریا میں للچائی ہوئی قیاس کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ لکڑی کی یہ پیٹیاں کبھی ریشم اور زربفت اور کمخواب کے تھان بن جاتی تھیں۔ کبہ ان کے دہانوں سے سونے کے کنگن اور چاندی کے تھال جھانکنے لگتے تھے۔ کبھی ان کے اندر بلوری فانوسوں اور شیشہ آلات کی مدھم سی کھن کھن سنائی پڑتی تھی۔ ماگھی رام کے باپ کی قوت لامسہ پیٹیوں کے اوپر ہاتھ پھیر پھیر کر اب اس یقین کی علی الاعلان تصدیق کرنے لگی تھی کہ یہ مال ڈیڑھ دو لاکھ روپے سے کم قیمت کا نہیں ہو سکتا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ لاٹری کا مال جلد از جلد بیچ باچ کر سارا کنبہ ہردوار جا بسے اور وہاں آرام سے بیٹھ کر رام نام کی مالا جپنے میں مصروف ہو جائے لیکن ماگھی رام کو اس لائحہ عمل سے شدید اختلاف تھا۔

"لو اور سنو۔" وہ حقارت سے ہنسا۔ "باپو کی عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے۔ بیکنٹھ سدھارنے کا وقت تو اس کا اپنا آیا ہوا ہے' اور اپنے ساتھ ہردوار ہمیں بھی ہانکتا ہے۔ باپو' تم

For more books visit www.4Urdu.com

جم جم ہردوار جاؤ۔ ہمارے کھانے پہننے کے دن تو اب آئے ہیں۔"

ماگھی رام کا فیصلہ تھا کہ لاٹری کا مال بیچ کر وہ لدھیانہ میں دکان کھولے گا۔ وہ کئی بار لدھیانہ جا کر بائیسکوپ دیکھ آیا تھا۔ فلموں میں ناچتی ہوئی میموں کا نقشہ اس نے کچھ ایسی فصاحت و بلاغت سے کھینچا کہ اس بڈھے کے منہ سے بھی جلیبیوں کے شیرے کی طرح بے اختیار رال ٹپکنے لگی۔ اور وہ بخوشی اس بات پر رضا مند ہو گیا کہ پہلے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ عرصہ لدھیانہ گزارے گا اور پھر اس کے بعد کسی وقت ہردوارہ کی راہ لے گا۔

پیٹیوں کو دکان کے عقبی صحن میں رکھوا کر ماگھی رام نے سب سے پہلے دو دو لڈو بانٹ کر ہمارا منہ میٹھا کرایا اور پھر کرم بخش کے ساتھ مل کر باپ بیٹا پیٹیاں کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ تینوں پیٹیاں سیکنڈ ہینڈ کتابوں' سکولوں کے پرانے رجسٹروں اور استعمال شدہ بہی کھاتوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھیں۔ چند لمحے سکوت رہا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ماگھی بنیا اور اس کا باپ زمین پر بیٹھ گئے اور دوہتڑ مار کر اپنا سر پیٹنے لگا۔ جس قسم کا درد ناک بین وہ کر رہے تھے اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں واقعی بری طرح لٹ پٹ گئے ہیں۔

کچھ دیر میں جب یہ آہ و زاری قدرے فرو ہوئی تو کرم بخش نے ان کو سمجھانا شروع کیا کہ چور ہاتھ سے نکل جائے تو دانشمند اس کی لنگوٹی پر ہی صبر شکر کر لیا کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ کوئی اتنا گھاٹے کا سودا نہیں رہا۔ پانچ روپے کی لاٹری میں اتنی ردی آ گئی ہے کہ کئی سال تک مٹھائیاں باندھنے کے کام آتی رہے گی۔ باپ تو گھٹنوں میں سر دیئے ہولے ہولے کراہتا رہا لیکن ماگھی رام پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا پیٹیوں کا سامان ایک ایک کر کے باہر نکالتا' اسے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھتا اور جب گدڑی میں چھپا ہوا کوئی لعل نظر نہ آتا' تو اسے کھٹاک سے زمین پر دے مارتا۔ جب اس نے بڑی تقطیع کی دو تین موٹی موٹی مجلد کتابیں غصے سے زمین پر پٹخیں تو کرم بخش چیل

For more books visit www.4Urdu.com

کی طرح جھپٹا اور ماگھی رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے چیخا۔ "ہاہا' لالہ' رہے نا اوت کے اوت۔ یہ تو دین اسلام کی کتابیں ہیں۔ پاک کلام کی بے حرمتی ہوئی تو گنڈاسا لے کر تربوز کی طرح سر اتار دوں گا۔ ہاں!"

URDU4U.COM

میں نے ایک جلد کھول کر دیکھی' تو رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد تھی۔

"کیوں' ہے نہ دین اسلام کی کتاب؟" کرم بخش نے پوچھا۔

"بڑی مقدس کتاب ہے۔" میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"میں تو پہلے ہی پہچان گیا تھا' یہ سالا بنیا اس کو بھی کاٹھ کباڑ کی طرح ردی میں پھینک رہا تھا۔" کرم بخش نے فسانہ آزاد کی چار جلدوں کو جھاڑ پونچھ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور انہیں ایک طرف بلندی پر رکھ دیا۔

اب کرم بخش نے حکم صادر کیا' کہ میں ساری کتابوں کو دیکھ بھال کر دین اسلام کی کتابیں الگ کر لوں۔" اپنے دین کی کتابیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کافروں کی دکان میں ردی کے طور پر انہیں نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں نے بڑی محنت سے جائزہ لے کر کوئی تیس کتابوں کا انتخاب کیا۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" ڈپٹی نذیر احمد کی "مرات العروس" "ایامہ" اور "رویائے صادقہ" عبدالحلیم شرر کی "فتح اندلس" "فلورا فلورنڈا" "ملک العزیز ورجنا" اور "فردوس بریں" محمد علی طیب کی "رام پیاری" محمود میاں رونق کی "حاتم بن طے" عرف "افسر سخاوت" حافظ محمد عبداللہ کی "الہ دین خوش نصیب" عرف "چراغ عجیب" محشر انبالوی کی "آل ذورعین" اور رتن ناتھ سرشار کے "فسانہ آزاد" کی چار جلدیں ملا کر کل ۱۸ کتابیں یہ ہوئیں۔ باقی بارہ جاسوسی ناول تھے جو فضل بک ڈپو لاہور نے شائع کئے تھے۔ ان میں سے پانچ ناولوں کا ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری نے انگریزی زبان سے کیا ہوا تھا۔

کرم بخش ان کتابوں کو اپنی چادر میں باندھنے لگا تو ماگھی رام نے اسے جھڑک کر کہا۔

"یہ کیا باندھ رہا ہے بے سالے؟ تھانے میں پرچہ نہ لکھوا دوں کہیں۔ میرا مال ہے۔ تیرے باپ کی جاگیر تھوڑی ہے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

"ہمارے سچے دین کی کتابیں ہیں۔ تیرے پاس کیسے چھوڑ دیں؟" کرم بخش نے مدلل جواب دیا۔

"ہم نے تیرے دین کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔" ماگھی رام بولا۔ "ایک ہاتھ سے پیسے رکھ دو' دوسرے ہاتھ سے کتابیں لے جاؤ۔ یہاں تو نقدا نقد سودا ہے۔"

URDU4U.COM

کتابوں کی قیمت پر ماگھی رام اور کرم بخش کے مابین بڑا زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ دونوں کی گردن کی رگیں چیخ چیخ کر پھول گئیں اور منہ سے جھاگ کے بلبلے اڑنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد ساڑھے چھ روپے پر معاملہ طے ہوا۔ ڈیڑھ روپیہ تو کرم بخش نے اسی وقت ادا کر دیا۔ پانچ روپے کل تک ادھار کر کے ہم نے تیس کتابیں اٹھا لیں۔

"کل صبح رقم پہنچ جائے۔" ماگھی بنئے نے کرم بخش کو خبردار کیا۔ "ورنہ بیاج لگ جائے گا۔"

کتابیں لے کر ہم سیدھے اپنی بیٹھک میں آئے۔ یہ گھر سے کافی دور مسجد کے بالکل ساتھ دو پکے کمرے تھے' جنہیں عام طور پر مردانہ مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کرم بخش نے ایک الماری صاف کی اور میں نے بڑے احترام سے کتابوں کو اس میں سجا تو دیا' لیکن ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر رہی کہ کل صبح تک ماگھی رام کو ادا کرنے کے لیے پانچ روپے کہاں سے آئیں گے۔

"تو پانچ روپے کو روتا ہے؟" کرم بخش نے مجھے تسلی دی۔ "دین پیارے کے لیے کرم بخش کی گردن بھی کٹ جائے تو پروا نہیں۔"

"چاچا' گردن تو مفت کٹ جاتی ہے لیکن ماگھی رام تو نقد مانگتا ہے۔ آخر پانچ روپے تم لاؤ گے کہاں سے؟"

"تو فکر نہ کر۔" کرم بخش نے بڑے وثوق سے کہا۔ "یہ تو دین اسلام کی بات ہے۔ رب سچے نے تو مجھے مجرا دیکھنے کے لیے بھی منہ مانگے پیسے دیئے ہیں۔"

"لیکن چاچا' کل صبح تک پیسے ملیں گے کیسے؟" مجھے یہ خطرہ ستا رہا تھا کہ اگر قرض

For more books visit www.4Urdu.com

جذبات پر مجھے شاباش دی اور بڑی رقت سے مجھے اپنے مرشد کے کچھ عارفانہ بیت ترنم سے سنائے' جن کا مطلب کچھ اس طرح کا تھا کہ دین کے علم میں غوطہ کھاؤ تو موتی مونگا پاؤ' دنیا کے علوم میں کھو جاؤ تو مردار ہڈیاں کماؤ اور کتوں کی طرح بیٹھ کر ساری عمر چباؤ۔

ایک پنتھ دو کاج' آم کے آم گٹھلیوں کے دام -------- سکول کو بھی سلام' ماسٹر منگل سنگھ سے بھی نجات اور تیس ناولوں کی دنیا آگے پیچھے آباد۔ اب میں صبح سویرے تیار ہو کر گھر سے سکول جانے کو نکلتا۔ کرم بخش مجھے بیٹھک میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتا۔ دوپہر کے وقت وہ کچھ روٹیوں پر تازہ مکھن اور شکر ڈال کے مجھے دے جاتا۔ اور چار بجتے ہی میں بستہ بغل میں دبائے' مسکین صورت بنائے پابندی سے گھر پہنچ جاتا۔ کرم بخش نے ہیڈ ماسٹر سوراج سنگھ کو جا کر بتا دیا' کہ ماسٹر منگل سنگھ کی پٹائی کے خوف سے بچے کا دل دہل گیا ہے۔ اسے تاپ چڑھتا ہے۔ تندرست ہوتے ہی سکول آنا شروع کر دے گا۔

کوئی تین ہفتے میں اسی طرح کرم کتابی بن کر اپنی بیٹھک میں معتکف رہا۔ جتنی محنت میں نے ان ایام میں کی ہے' ساری عمر پھر کبھی نہیں کی۔ بیس بائیس دن کے بعد جب میں نے دوبارہ سکول جانا شروع کیا' تو حبس دم کرنے والے جوگیوں کی طرح میری کایا کلپ ہو چکی تھی۔ ماسٹر منگل سنگھ کے خوف سے زبان میں لکنت کی جگہ "آب حیات" کے پر شکوہ فقرے فراٹے بھرنے لگتے تھے۔ تنہائی میں میری حدیث نفس بھی عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی عبارت میں ہونے لگی۔ کلاس روم میں تابڑ توڑ تین چار جواب مضمون لکھ کر میں نے اپنا سکہ کچھ ایسا بٹھا لیا کہ کبھی کبھی ماسٹر منگل سنگھ اردو کا سبق میرے سپرد کر کے خود غائب ہو جاتے تھے۔ چار پانچ ہندو لڑکے تو آرام سے سبق پڑھ لیتے تھے۔ لیکن سکھ طالب علم الگ بیٹھ کر بڑا اودھم مچاتے تھے۔ سبق کے دوران وہ "جو بولے سو نہال ------ ست سری اکال" کے نعرے لگاتے رہتے تھے' اور اخیر میں کھڑے ہو کر زور زور سے ڈیسک بجاتے تھے اور میری طرف مکے

For more books visit www.4Urdu.com

ادا نہ ہوا تو ماگھی بنیا کتابیں ہی واپس لے جائے گا۔

"اجیپھا' اجیپھا' بچے اجیپھا" کرم بخش نے دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجا بجا کر مزے سے کہا۔ "آج رات پرانی باؤلی میں ڈھائی پہر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اجیپھا پڑھ دوں گا۔ سورج بعد میں نکلے گا' پیسے پہلے پہنچ جائیں گے۔"

اپنے وظیفے کی شان میں کرم بخش نے پنجابی کے کچھ بیت گا گا کر پڑھے۔ ان میں اللہ کی حمد اور رسول اللہ کی ثنا بھی تھی۔ رسول اللہ کا نام آتے ہی کرم بخش اپنے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا تھا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگتا تھا۔ کرم بخش کو عقیدت مندی کی آگ میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیچ و تاب کھاتے دیکھ کر میں بھی اپنی عیاری کا جال بچھا کر تاک میں بیٹھ گیا۔ اور موقع پا کر بڑی صفائی سے اس کی سادہ لوحی کے نہلے پر اپنی مکاری کا دہلا دے مارا۔ وہ پگھلے ہوئے موم کا تودہ بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے فن آذری کے دو چار ہاتھ چلائے اور بڑی آسانی سے اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

سانچہ یہ تھا کہ خالصہ ہائی سکول کفر کا گہوارہ ہے۔ اسلام کے ارکان خمس کے بجائے سکھوں کے پانچ ککوں ------- کنگھا' کھیس' کچھ' کڑا' کرپان سے واسطہ پڑتا ہے۔ شبد گانے پڑتے ہیں۔ اساوری کے کیرتن میں شامل ہونا ضروری ہے۔ جپ جی اور ارداس کا سیکھنا بھی لازمی ہے۔ گرو گرنتھ کے پاٹھ میں سر زمین پر رکھ کر نمسکار بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور گیانیوں' گرنتھیوں' پاٹھکوں اور سیوا کاروں کے منہ سے دن رات مسلمانوں کے خلاف مغلظات بھی سننا پڑتی ہیں۔ اپنا دین بچانے کے لیے ضروری ہے کہ میں ان خطرات میں مبتلا ہونے سے پہلے اپنا ایمان مضبوط کر لوں اور دوبارہ سکول جانے سے پہلے کچھ دن لگا کر وہ بصیرت افروز کتابیں پڑھ لوں جو ہم اتنی محنت سے ماگھی رام کے پنجے سے چھڑا کر لائے ہیں۔

کرم بخش تو پہلے ہی رس گلے کی طرح دین اسلام کے شیرے میں لتھڑا ہوا بیٹھا تھا۔ میری چرب زبانی کے جالے میں وہ مکڑی کی طرح فٹ ہو گیا۔ اس نے میرے دینی

For more books visit www.4Urdu.com

تان تان کر اپنا مخصوص قومی ترانہ گاتے تھے۔

راج کرو گا خالصہ -------- باقی رہے نہ کو

کچھ عرصہ کے بعد "سنگھ سبھا" کا تہوار آیا۔ یہ سکھوں کا سالانہ میلہ تھا جو چمکور صاحب میں لگا کرتا تھا۔ اس موقعہ پر سکھوں کا ایک دیوان بھی منعقد ہوتا تھا۔ جس میں سکھ پنتھ کی شان اور گرو صاحبان کی عظمت پر بڑی دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ اس سال خالصہ ہائی سکول کی طرف سے "دیوان" میں گرو نانک پر مضمون پڑھنے کے لیے میرا انتخاب ہوا۔

میں نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں سے شجاعت و سخاوت و ذکاوت کے قصے نکالے' رتن ناتھ سرشار سے میاں آزاد کا دم خم اڑایا' الفاظ و بیاں کی شوکت محمد حسین آزاد سے لی اور کئی کتابوں کے صفحے نقل کر کے ان میں مناسب ترمیم و تحریف کے بعد ایک ست رنگ خلعت فاخرہ تیار کر کے گرو مہاراج شری نانک دیو کو پہنا دی۔ مضمون کے آخر میں گرونانک کی مدح میں بیس اشعار کا ایک منظوم قصیدہ بھی تھا۔

اس قصیدے کی تیاری میں محشر انبالوی کی تصنیف "آل ذورعین" سے بڑی مدد ملی۔ یہ کتاب دراصل ارائیں برادری کی تاریخ تھی جس میں فاضل مصنف نے اس قوم کو عرب کے ایک نجیب الطرفین قبیلے ذورعین کی آل اولاد ثابت کیا تھا۔ عجیب و غریب تاریخی حقائق و شواہد کے علاوہ اس کتاب میں ارائیوں کی عظمت و فضیلت پر بہت سی نظمیں بھی تھیں۔ بحر طویل میں ایک نظم مجھے پسند آئی۔ میں نے اس میں

For more books visit www.4Urdu.com

"بلبلان بے نظیر" "صلعلان ہم سفیر" جیسی ترکیبیں حذف کر دیں۔ اور ان کی جگہ گرونانک دیو کے جملہ القاب و صفات کو ٹھونس کر ایک شاندار قصیدہ تیار کر لیا۔

URDU4U.COM

سنگھ سبھا کے دیوان میں ڈھائی تین ہزار کا مجمع تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ کرسی صدارت پر متمکن تھے۔ پنڈال میں ایک طرف نہنگ اکالی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نرنکاریوں کا اجتماع تھا۔ ایک کونے میں کلال گڑھی کے کچھ مونے سکھ تھے۔ درمیان میں عوام الناس زمین پر بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر اوپر دائیں طرف علاقے کے افسروں اور رئیسوں کی کرسیاں تھیں۔ بائیں جانب ہمارے سکول کا سٹاف تھا۔

پنڈال سے باہر ایک کونے میں تیس چالیس مسلمان مرد و زن بھی اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے تھے۔ یہ چمکور کی ارائیں برادری تھی جو کرم بخش کی ترغیب پر سکھوں کی بھری محفل میں میری تقریر کا محیر العقل کارنامہ دیکھنے کے شوق میں چلے آئے تھے۔

سٹیج پر آ کر مجھے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ میرا کام تو فقط زبان ہلانا تھا۔ ورنہ فقرے پر فقرہ تو شرر اور سرشار اور آزاد کے قلم سے نکل کر خود بخود پروار کرتا تھا۔ پنڈال میں بالکل سکوت تھا۔ جب میں نے ترنم سے بحر طویل کا قصیدہ الاپنا شروع کیا تو یہ سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔ میری تقریر دلپذیر ختم ہوئی تو پنڈال میں کئی جانب سے "شاباش۔" "شاباش" کی آوازیں آئیں۔ مہاراجہ پٹیالہ جو کرسی صدارت میں نیم خوابیدہ بیٹھے تھے' اچانک چونکے انہوں نے مجھے تھپکی دی۔ اپنی جیب سے ملکہ وکٹوریہ کی مورت والا چاندی کا ایک روپیہ نکالا' اسے انگلی پر آویزاں کر کے انگوٹھے سے اچھال کر ٹن سے بجایا' اور مجھے انعام میں دیدیا'

دیوان ختم ہوتے ہی میری جماعت کے سکھ لڑکے مجھے کشاں کشاں سکول کے پچھوڑے میں لے گئے۔ کچھ دیر انہوں نے "راج کروگا خالصہ۔۔۔۔ باقی رہے نہ کو" الاپ الاپ کر میرے گرداگرد بھنگڑا ڈالا اور پھر مہاراجہ پٹیالہ کے انعام کا روپیہ زبردستی چھین کر لے گئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میرے مضمون اور قصیدے کی کامیابی نے گویا میرے سینے میں بندھی ہوئی بہت سی گھنڈیاں کھول دیں۔ "آل ذورعین" کی نظموں سے قافیے اور ردیف جمع کر کے اب میں نے کچھ اپنی تک بندی بھی شروع کر دی۔ پہلے رونق جموی تخلص رکھا۔ پھر کسی ضرورت شعری سے مجبور ہو کر جعفر چمکوری سے بدل ڈالا۔ میرا ایک شعر خاص طور پر ہمارے سکول میں زبان زد خاص و عام ہو گیا' اور سکھ طلبہ بھی اسے شوق سے اپنے جواب مضمونوں میں استعمال کرنے لگے۔ شعر عرض کیا تھا

یہ ایسا عجب شہر چمکور ہے
کہ ثانہ نہیں جس کا لاہور ہے

رفتہ رفتہ میں نے اپنی بیاض بھی کھول لی۔ ایک روز شام کے وقت میں نہر کے کنارے ٹہل ٹہل کر فکر سخن کر رہا تھا' کہ ماسٹر منگل سنگھ بائیسکل پر سوار ادھر سے گذرے۔ مجھے دیکھ کر رک گئے اور بیاض لے کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ایک دو جگہ ٹھٹک کر مجھے گھورا اور غصے سے "ہوں۔" "ہوں" کہا۔ پھر ایک غزل پر پہنچے جس میں عرض کیا تھا۔

مرے منہ پر زلفیں گرانے کو آ جا
مری بات بگڑی بنانے کو آ جا
تری یاد کی گھنٹیاں بج رہی ہیں
مرے دل کی دنیا بسانے کو آ جا
برا حال ہے جعفر خستہ جاں کا
مری جان جاناں بچانے کو آ جا

ماسٹر منگل سنگھ بجلی کی طرح تڑپے' اور بیاض پھاڑ کر نہر میں پھینک دی۔ پھر وہ دونوں

For more books visit www.4Urdu.com

ہاتھ کمر پر رکھ کر جلاد کی طرح میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور کڑک کر بولے۔
"ورنیکلر فائنل کا امتحان سر پر آیا کھڑا ہے۔ اور یہ مرزا غالب کی اولاد شاعری کے ٹل کھڑکا رہی ہے۔ کیوں بے' یہ کیا واہیات بکواس ہے؟"
URDU4U.COM
انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور ٹانگ گھما کر زمین پر پٹخ دیا۔ پھر وہ دیر تک لاتوں' مکوں اور تھپڑوں سے میری خاطر خواہ تواضع فرما کر اپنے بائیسکل پر سوار ہو کے رخصت ہو گئے۔ میں نے اٹھ کر گالوں اور کہنیوں کو سہلایا' کپڑے جھاڑے اور اطمینان کی سانس لے کر ازسر نو مشق سخن میں مصروف ہو گیا۔

ورنیکلر فائنل کے لیے ہمارے امتحان کا سنٹر گورنمنٹ ہائی سکول روپڑ مقرر ہوا۔ روپڑ کا شہر چمکور صاحب سے کوئی گیارہ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ تین چار بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم سب فارسی کے استاد پنڈت سری رام کی قیادت میں ایک روز پہلے وہاں پہنچ گئے۔ سکھوں کے ایک مقامی ہوسٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ سورج غروب ہوتے ہی کھانے کی گھنٹی بجی سب لڑکے اپنی اپنی رکابی' گلاس اور گھی لے کر لنگر خانے میں حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ مسلمان بس ایک میں ہی تھا۔ اس لیے مجھے چوکے سے باہر دوسروں سے الگ خاصی دور بٹھا دیا گیا۔ ایک لالنگری کڑچھی ہاتھ میں لیے دال بانٹ رہا تھا۔ دو سکھ ایک بہت بڑے توے پر تیز رفتاری سے پھلکے پکا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی داڑھیاں کھجلاتے تھے۔ اور پسینے کے بڑے بڑے قطرے روٹیوں کے لیے گندھے ہوئے آٹے میں مسلسل ٹپک رہے تھے۔ یوں بھی وقتہ فوقتہ وہ اپنی گردن اور بغلوں کا پسینہ پونچھ کر انہی گیلے ہاتھوں سے چپاتیاں پکانے لگتے تھے۔ دال والا لالنگری بھی دیگچے کے آس پاس زور زور سے ناک صاف کرتا تھا' اور رینٹ کو انگلوں کے درمیان دیر تک کولڈ کریم کی طرح ملتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ بار بار کھانس کر بلغم کے بڑے بڑے غلفے اپنے سامنے تھوک کر انہیں انڈوں کی زردی کی طرح پاؤں کے انگوٹھے سے مسل دیتا تھا۔ لالنگریوں کے یہ بے تکلفانہ انداز دیکھ کر میرا جی متلانے لگا' اور میں سر درد کا بہانہ کر کے کھانا کھائے بغیر لنگر سے اٹھ آیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

ہوسٹل کے جس کمرے میں مجھے جگہ ملی' اس میں دس بارہ سکھ لڑکے اور بھی تھے۔ سونے سے پہلے انہوں نے کپڑے اتار ڈالے۔ کچھ دیر ننگے ٹہل کر جسم کو ہوا لگائی اور پھر ایک ایک کچھرا اور بنڈی پہن کر بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے کیس کھولے اور انہیں جھٹک جھٹک کر کنگھا کیا۔ پھر سرسوں کا تیل ڈال کر داڑھیاں چڑھائیں اور ان پر میلی میلی پٹیاں سی باندھ لیں۔ بغلوں کے لانبے لانبے بالوں کو بھی انگلیوں سے مروڑ مروڑ کر ان میں کنڈل ڈالے' اور اس ٹائلٹ سے فارغ ہو کر وہ بڑی دیر تک آپس میں فحش گفتگو اور دھینگا مشتی کرتے رہے۔ دو لڑکوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر ہتھ رسی کا مقابلہ کیا۔

لنگر سے وہ آپس میں شرطیں لگا کر چنے کی دال کے ساتھ بیس بیس تیس تیس چپاتیاں کھا کر آئے تھے۔ اب رضائی میں لیٹ کر اگر ایک لڑکا ڈکار لیتا تھا' تو باقی سب بھی اس کے مقابلے میں زور زور سے ڈکارتے تھے۔ اگر ایک لڑکے سے بادشکم کا جھونکا سرزد ہوتا تھا' تو دوسرے بھی باآواز بلند اس کا ساتھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرے کی فضا میں سنڈاس کی کثافت رچ گئی' اور رضائی میں منہ سر لپیٹے بھی مجھے ساری رات ابکائیاں آتی رہیں۔ صبح نو بجے پرچہ تھا۔ پرچہ ختم ہوتے ہی میں امتحان کے ہال سے نکلا' اور پاپیادہ چلتا ہوا غروب آفتاب کے وقت چمکور صاحب پہنچ گیا۔

اگلی صبح پھر میں چار بجے دوسرا پرچہ دینے روپڑ کے لیے پیدل روانہ ہو گیا۔ کرم بخش مجھے نہر تک چھوڑنے آیا۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ چاروں طرف بڑی گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ گھاس پر کورا جما ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں دور تک پھیلے ہوئے جونڈ یوں نظر آتے تھے جیسے بہت سے ہاتھی سونڈ اٹھائے کھڑے ہیں۔ وقتہ فوقتہ گیدڑوں کے چیخنے کی آواز بھی آتی تھی۔ ان کی چیخوں کے ساتھ گاؤں کے کتے بھی زور زور سے رونے لگتے تھے۔ ان دنوں سارے علاقے پر جگموہن سنگھ ڈاکو اور اس کے گروہ کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی شجاعت' سخاوت اور بے رحمی کے عجیب و غریب قصے

For more books visit www.4Urdu.com

زبان زد خاص و عام تھے۔ کبھی کبھی میرے دل میں ایک دبی دبی خواہش چوری چوری سر اٹھاتی تھی کہ اگر قسمت یاوری کرے اور جگموہن سنگھ ڈاکو مجھے پکڑ کر اپنے گروہ میں شامل کر لے تو میری زندگی کا بھی کوئی مقصد بن جائے۔

URDU4U.COM

کرم بخش نے مجھے بتایا کہ جگموہن آج کل شملہ پہاڑ کے راجوں اور رجواڑوں کی لوٹ مار میں مصروف ہے۔ اس لیے نہر سرہند کا کنارا مسافروں کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ تاہم احتیاطاً اس نے میری پاکٹ واچ اتروا کے اپنے پاس رکھ لی۔

مجھے نہر تک پہنچا کر کرم بخش واپس لوٹ گیا۔ میں نے اپنی لاٹھی کندھے پر رکھی اور روپڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہنے کو تو میں روانہ ہو گیا' لیکن دراصل میرے پاؤں میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ کچھ سردی اور کچھ خوف سے میرا تن بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اور آس پاس ذرا سی کھڑکھڑاہٹ سے دل اچھل کر گلے میں پھنس جاتا۔ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ نہر کی پٹڑی کے عین درمیان دو انگارہ سی آنکھیں مجھے گھورتی نظر آئیں۔ میں نے کھانس کھانس کر اپنی لاٹھی زمین پر زور زور سے ماری' تو جنگلی بلا "میاؤں" کر کے جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔ چاروں طرف چھائے ہوئے سناٹے کے گنبد میں وہ "میاؤں" دیر تک صور اسرافیل کی طرح گونجتی رہی۔ دو چار گیدڑ بھاگتے ہوئے آئے اور میرا راستہ کاٹ کر گزر گئے۔ ایک درخت پر اتنی چمگادڑیں پر پھیلائے الٹی لٹکی ہوئی تھیں کہ شاخوں پر کالا کالا سائبان سا تن گیا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سے ان کے آرام میں خلل پڑا تو چند چمگادڑیں عجیب خوفناک آواز سے چلائیں۔ آگے گیا تو ایک ٹنڈ منڈ درخت پر بہت سے بندر اور چند لنگور شاخ بشاخ الٹی قلابازیاں کھا رہے تھے۔ ایک لنگور بڑی عجیب بازیگری دکھا رہا تھا۔ درخت کی شاخ کے گرد وہ اپنی دم لپیٹ کر جھولے کی طرح جھولتا تھا' اور پھر فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا کسی دوسری شاخ کی طرف لپکتا تھا۔ لیکن دوسری شاخ کو چھوئے بغیر وہ اسی طرح ہوا میں قلابازی کھا کر واپس لوٹتا تھا' اور حسب سابق پہلی شاخ کے ساتھ الٹا لٹک جاتا تھا۔ اس طرح کی اصلی لنگوری جست زندگی میں صرف اسی روز دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔ اس کے بعد

For more books visit www.4Urdu.com

یہ کرتب فقط امور ریاست اور سیاست اور سفارت ہی میں نظر آئے ہیں۔ دو تین بندر نہر کی پٹڑی پر بھی بیٹھے تھے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ نیت تو میری دیر سے ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔ اب بندروں اور لنگوروں کو اپنی راہ میں حائل دیکھا تو دل نے بے اختیار گواہی دی کہ جان ہے تو جہان ہے پیارے۔ امتحان کو گولی مارو' اور آرام سے گھر واپس لوٹ چلو۔ ورنیکلر فائنل اگلے سال بھی ہو جائے گا۔ میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ سناٹے میں دور سے "ہری اوم' ہری اوم" کی آواز لہرائی' اور تاریکی میں ایک پتلا سا سایہ ابھرا' اور "ہری اوم'" "رام رام ست ہے" کی مالا جپتا تیز تیز میرے قریب سے گزر گیا۔ یہ مکسودن پادھا تھا۔

مکسودن پادھا چمکور صاحب کے ہندوؤں کا پروہت تھا۔ سکھ اور مسلمان بھی اس سے اپنے بچوں کی جنم پتریاں بنواتے تھے۔ نجوم اور رمل میں مہارت کے باعث سارے گاؤں میں شادی بیاہ کی تاریخ' سفر پر روانہ ہونے کی ساعت' اور مرگ و حیات کی جملہ رسومات کا پروگرام وہی طے کرتا تھا۔ عام بیماریوں کا علاج تو حکیم بسنت رام کے سپرد تھا۔ لیکن چیچک' خسرہ' پلیگ اور ہیضہ جیسے موذی امراض پر مکسودن پادھا کا کنٹرول تھا۔ اذان کی آواز پر وہ خالی ٹین بجانا شروع کر دیتا تھا' تاکہ بول سنائی نہ دیں۔ درود شریف سن کر وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا تھا۔ جب کبھی وہ ہمارے محلے سے گزرتا تھا' تو مسلمان بچے زور زور سے درود شریف پڑھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ یہ سن کر مکسودن پادھا کانوں میں انگلیاں دئے اتنی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیتا تھا کہ ہم لوگ بھی اس کے تعاقب میں بری طرح ہانپنے لگتے تھے۔

مکسودن پادھا کا معمول تھا کہ وہ صبح تین چار بجے اٹھ کر زور زور سے ہری اوم' ہری اوم' رام رام ست ہے کہ مہارنی کرتا ہوا نہر پر جاتا تھا۔ اور گرمی ہو یا کڑاکے کی سردی ٹھنڈے پانی سے اشنان کر کے اپنی پوجا پاٹ شروع کرتا تھا۔ اس کے معمول میں ایسی باقاعدگی تھی کہ اس کے نہر پر جانے اور واپس آنے کی آواز لوگوں کے لیے الارم ٹائم پیس کا کام دیتی تھی۔

For more books visit www.4Urdu.com

میرے قریب سے گزر کر مکسودن پادھا جب بندروں کے پاس پہنچا' تو ان کا ایک جم غفیر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ ہنومان جی کو نمسکار کر کے مکسودن نے ایک پوٹلی کھولی اور بہت سی پوریاں بندروں کے سامنے ڈال دیں۔ پھر وہ نہر کے کنارے ایک پتھر کی سل پر بیٹھ گیا اور پانی کی گڑویاں سر پر ڈال ڈال کر چھپا چھپ نہانے لگا۔

ایک ساٹھ ستر برس کے دبلے پتلے مختنی سے برہمن کی یہ شان مردانگی دیکھ کر میرے اسلام کی رگ حمیت بھی کسی قدر پھڑکی۔ میں چھاتی نکال کر لاٹھی گھماتا بڑے آرام سے بندروں کے پاس سے نکل آیا جن کی توجہ بہرحال پوریوں پر مرکوز تھی۔ اور مکسودن پادھا سے کچھ دور رک کر اس کی رام رام کے جواب میں زور زور سے درود شریف پڑھنے لگا۔ مکسودن پادھا نے پہلے تو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر آواز کی سمت کا کھوج لگایا اور پھر درود شریف کے الفاظ سن کر اس نے یک لخت دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میں درود شریف بند کرتا تھا' تو وہ کان کھول دیتا تھا۔ اور جب دوبارہ پڑھنے لگتا تو پھر انگلیاں ٹھونس لیتا۔ جی تو بہت چاہا کہ ہری اوم ہری اوم اور درود شریف کی آنکھ مچولی کا یہ کھیل جاری رکھوں۔ لیکن میری منزل کھوٹی ہوتی تھی۔ اس لیے میں باآواز بلند درود شریف کا ورد کرتا آگے بڑھ گیا۔ درود شریف پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ رگوں میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ پھر جسم پر ہلکی ہلکی حرارت کی ٹکور ہونے لگی۔ اور اس کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے الیکٹرک بلینکٹ اوڑھا ہوا ہو۔ تین سوا تین گھنٹے کے بعد جب میں امتحان کے ہال میں پہنچا تو خاصا پسینہ آیا ہوا تھا۔ میں نے آرام سے پرچہ کیا' اور پھر ہال سے اٹھ کر درود شریف پڑھتا ہوا خراماں خراماں شام تک گھر پہنچ گیا۔

جب نتیجہ نکلا' تو ورنیکلر فائنل کا وظیفہ تو مجھے صرف دو برس کے لیے ملا' لیکن درود شریف کا وظیفہ میرے نام تاحیات لگ گیا۔

یہ ایک ایسی نعمت مجھے نصیب ہوئی جس کے سامنے کریم بخش کے سارے "اجیہے" گرد تھے۔ اس کے لیے نہ پرانی باؤلی کے پانی میں رات کو دو دو پہر ایک ٹانگ پر کھڑا

For more books visit www.4Urdu.com

ہونا پڑتا تھا۔ نہ کنوئیں میں الٹا لٹک کر چلہ معکوس کھینچنے کی ضرورت تھی۔ نہ گگناماڑی میں ڈھول کی تال پر کئی کئی گھنٹے "حال" کھیلنے کی حاجت تھی۔ نہ مراقبے کی شدت تھی' نہ مجاہدے کی حدت تھی' نہ ترک حیوانات' نہ ترک لذات' نہ تقلیل طعام' نہ تقلیل منام' نہ تقلیل کلام' تقلیل اختلاط مع الانام' نہ رجعت کا ڈر' نہ وساوس کی فکر' نہ خطرات کا خوف۔ یہ تو بس ایک تخت طاؤس تھا' جو ان دیکھی لہروں کے دوش پر سوار آگے ہی آگے' اوپر ہی اوپر رواں دواں رہتا تھا۔ درود شریف نے میرے وجود کے سارے کے سارے افقوں کو قوس قزح کی لطیف رداؤں میں لپیٹ لیا۔ گپ اندھیروں میں مہین مہین سی شعاعیں رچ گئیں' جنہیں نہ خوف و ہراس کی آندھیاں بجھا سکتی تھیں نہ افکار و حوادث کے جھونکے ڈگمگا سکتے تھے۔ تنہائی میں انجمن آرائی ہونے لگی۔ بھری محفل میں حجروں کی خلوت سما گئی۔ دل شاد' روح آباد۔ جسم یوں گویا کشش ثقل سے بھی آزاد۔ سب سے بڑی بات یہ تھی' کہ درود شریف کی برکت سے پردہ خیال پر ایک ایسی بابرکت ذات کے ساتھ قربت کا احساس جاری و ساری رہتا تھا۔ جس کے پاؤں کی خاک اغواث اور اقطاب اور اوتار و ابدال کی آنکھ کا سرمہ۔ جس کے قدموں میں دنیا کامران اور عقبیٰ بھی بامراد۔ جس کے ذکر کے نور سے عرش بھی سر بلند اور فرش بھی سرفراز۔ جس کا ثانی نہ پہلے پیدا ہوا' نہ آگے کبھی ہو گا۔ اور جس کی آفرینش پر رب البدیع الخالق الباری المصور نے اپنا صناعی کی پوری شان تمام کر دی

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلو علیہ وآلہ

For more books visit www.4Urdu.com

دو برس بعد میں نے میٹریکولیشن کا امتحان بھی بالکل اسی طرح روپڑ اور چمکور صاحب کے درمیان روزانہ پاپیادہ آتے جاتے اور درود شریف کا ورد کرتے کرتے پاس کر لیا۔

URDU4U.COM

دادی اماں چند ماہ قبل فوت ہو گئی تھیں۔ ایک دن سخت سردی میں انہوں نے حسب معمول ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے دھوپ میں بال سکھائے۔ رات کو بخار چڑھا اور اگلے روز ڈبل نمونیہ تشخیص ہوا۔ جب حالت زیادہ بگڑ گئی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ "پت' اب چل چلاؤ ہے۔ مولی کھانے کو جی چاہتا ہے۔ چوری چوری لا کر مجھے کھلا دو۔"

میں بھاگ کر کھیتوں سے دو بڑی بڑی تازہ مولیاں لے آیا۔ دادی اماں نے رضائی سے منہ سر ڈھانپ لیا اور نمک لگا لگا کر دونوں مولیاں مزے سے کھا لیں۔ اسی شام ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۰۸ برس کے قریب تھی۔

یوں تو کرم بخش پر خوشی زیادہ اثر انداز ہوتی تھی نہ غمی۔ اس پر کبھی گرمی کا اثر ہوتا تھا نہ سردی کا۔ کانٹوں کا نہ سانپ کا' بچھو' بجو اور لسنگہ پوٹ کا۔ لیکن دادی اماں کی موت کے بعد وہ بھی دنیا کے بے ثباتی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اور گگا ماڑی جا کر ڈھول بجانے والے ملنگوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

چمکور کے گرد' نواح میں دور دور کالج نہ تھا۔ اس لیے میں بھی جموں واپس لوٹ آیا اور پرنس آف ویلز کالج میں ایف' ایس' سی کا داخلہ لے لیا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چائے

بابا اجیت سنگھ جھجھار ہری خالصہ ہائی سکول سے اٹھ پرنس آف ویلز کالج جموں کا داخلہ ویسا ہی تھا جیسے کسی دور افتادہ گاؤں کا دیہاتی اچانک بڑے شہر میں وارد ہو جائے۔ چند روز قدرے بوکھلاہٹ رہی۔ لیکن جب میں نے بھی دوسروں کی طرح کوٹ پتلون زیب تن کر کے گلے میں ٹائی کا پھندا ڈال لیا تو بڑی آسانی سے "ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد" کے محاورے میں ڈھل گیا۔

URDU4U.COM

پتلوں پہن کر پہلی بار باہر نکلا تو بڑا حجاب آیا۔ کیوں ہر قدم پر یہی احساس ہوتا تھا' کہ میں سڑک پر ننگا ہی چلا آیا ہوں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جو لوگ پاجامہ پہنے باہر گھومتے پھرتے نظر آتے تھے' ان پر برہنگی کا شبہ ہونے لگا۔

اردو کا جھنڈا تو میں خالصہ ہائی سکول میں گاڑ ہی آیا تھا۔ اب کالج آ کر میں نے انگریزی زبان کو اپنا تختہ مشق بنا لیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر میں نے کالج لائبریری میں شکیسپیئر سے لے کر زمانہ حال تک جتنا انگلش لٹریچر موجود تھا' اس کا بیشتر حصہ ایسے ہی چلتے پھرتے کھنگال ڈالا۔ ٹامس ہارڈی اور رابرٹ لوئی سٹیونسن مجھے پسند آئے۔ لیکن میری جان کو جس کا اصلی روگ لگ گیا' وہ پی۔ جی وڈ ہاؤس تھا۔

وڈ ہاؤس طنز و مزاح کی ایک چھوٹی سی شفاف جھیل ہے۔ نہ زیادہ لمبی چوڑی نہ زیادہ گہری۔ اس میں فلسفہ کا جھاڑ جھنکار اگتا ہے۔ نہ نظر بات کی لہریں اٹھتی ہیں۔ محدود وسعت کی کہانیوں سے وہ لامحدود تفنن طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زبان اس پر کبھی حاوی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود زبان پر اس درجہ حاوی رہتا ہے' کہ موم کی ناک کی طرح اسے جس طرف چاہے مروڑ کر اپنے بے نظیر اسلوب بیان میں ڈھال لیتا ہے۔ اس نے ۸۸ سے اوپر تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک ایک کتاب کئی کئی بار پڑھنے سے بھی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ انگلش لٹریچر کی تاریخ میں اس کا شمار ان لوگوں میں تو نہ ہو گا جنہیں

For more books visit www.4Urdu.com

کلاسیکی درجہ دیا جاتا ہے لیکن اگر وڈ ہاؤس پیدا نہ ہوا ہوتا تو انگریزی زبان کی بہت سی نزاکتیں اور لطافتیں تشنہ اظہار رہ جاتیں۔

URDU4U.COM

علمی انگریزی تک رسائی تو لائبریری کے ذریعہ ہو گئی' لیکن عملی انگریزی کا تجربہ مجھے اپنے والد بزرگوار سے حاصل ہوا۔

عبداللہ صاحب ایک دریا کی طرح تھے' جو نہایت خاموشی سے نظروں سے اوجھل زیر زمین بہہ رہا ہو۔ پانچ چھ برس کی عمر میں جب وہ یکایک یتیم ہو گئے' تو انکشاف ہوا کہ ان کا بال بال قرضہ میں بندھا ہوا ہے' اور گھر کی ساری زمین اور مکان ساہو کاروں کے پاس رہن رکھے ہوئے ہیں۔ موروثی زر اور زمین کی یہ بے ثباتی دیکھ کر عبداللہ صاحب نے اب ایسی جائیداد بنانے کا تہیہ کر لیا' جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ وہ دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اس زمانے میں چمکور صاحب میں کوئی سکول نہ تھا۔ پرائمری سکول پانچ میل دور تھا' مڈل سکول گیارہ میل اور ہائی سکول بیس میل۔ دو دو سال کا امتحان ایک ایک سال میں ختم کر کے اور وظیفہ لے کر عبداللہ ضلع انبالہ سے میٹریکولیشن کے امتحان میں اول آئے۔

ان دنوں سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کا بڑا چرچا تھا۔ لدھیانہ کی انجمن مفید عام اس تحریک سے متاثر تھی۔ پنجاب میٹریکولیشن میں غالباً پہلی بار کوئی مسلمان لڑکا ایک ضلع میں اول آیا تھا۔ عبداللہ صاحب کا ریزلٹ دیکھ کر انجمن مفید عام کا ایک کارکن چمکور صاحب آیا' اور عبداللہ صاحب کو علی گڑھ سر سید کے پاس لے گیا۔ وہاں پر انہوں نے انگریزی' عربی' فارسی' فلسفہ اور ریاضی میں اپنی دھاک بٹھائی۔ اور علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں بی۔ اے کر لیا۔

بی۔ اے کے بعد سر سید کی وساطت سے انہیں انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان کے لیے وظیفہ ملا۔ اس زمانے کے توہمات میں سات سمندر پار کا سفر بلائے ناگہانی کے مترادف تھا۔ چنانچہ دادی اماں نے اپنے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ

For more books visit www.4Urdu.com

صاحب سعادت مند فرزند تھے۔ انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔ سر سید کو مسلمان نوجوانوں کا مستقبل سنوارنے کے دھن ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔ انہوں نے عبداللہ صاحب کو بڑا سمجھایا بجھایا' ڈرایا اور دھمکایا۔ غصے میں آ کر کچھ پٹائی بھی کی۔ لیکن ماں کی خواہش کے سامنے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر مایوس ہو کر سر سید نے انہیں علی گڑھ سے نکال دیا اور حکم دیا کہ اب وہ عمر بھر اپنی منحوس صورت انہیں نہ دکھائیں' اور ایسی جگہ جا کر مریں جہاں کوئی ان کا نام نہ لینے والا ہو۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند فرزند تھے' اتنے ہی اطاعت گزار شاگرد بھی تھے۔ سر سید کے حکم کی لاج انہوں نے اس طرح رکھی کہ گلگت کے دور افتادہ مقام پر جا کر کلرکی اختیار کر لی۔ ان دنوں چمکور صاحب سے سرینگر کے راستے گلگت پہنچنے کے لیے بیس بائیس روز لگتے تھے۔ ایک سو آٹھ سال کی عمر میں وفات پانے تک دادی اماں نے کبھی گاؤں سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ اس لیے وہ خوش تھیں کہ گلگت جا کر بٹیا گھر کے پاس ہی رہا' سات سمندر پار تو نہیں گیا!

گلگت کی کلرکی عبداللہ صاحب کو بڑی راس آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشمیر راج کی طرف سے وہاں کے گورنر بن گئے۔ گلگت میں انہوں نے اٹھارہ بیس برس گزارے۔ ان کے سب بچوں کی پیدائش بھی وہیں پر ہوئی۔ تین بیٹے' تین بیٹیاں۔ اس علاقے کی بین الاقوامی اہمیت اور چینی اور روسی ہمسایوں کے معاملات پر انہیں خاصا عبور حاصل تھا۔ کشمیر کے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ساتھ ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ اس کی وفات کے بعد جب مہاراجہ ہری سنگھ گدی پر بیٹھا' تو اس سے ان بن ہو گئی۔ سینتالیس سال کی عمر میں عبداللہ صاحب نے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی' اور مستقل طور پر جموں میں قیام پذیر ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا' جب جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کی صدیوں سے خوابیدہ قسمت انگڑائی لینے لگی تھی۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پردے میں چودھری غلام عباس نے اپنی

For more books visit www.4Urdu.com

سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی سرینگر میں ایسوسی ایشن کی برانچ کھول کر سیاست کے خارزار میں پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ مسلمانان ریاست کے افق پر دو نوجوان تیزی سے ابھرے' اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی آسمان پر پوری تابانی سے چھا گئے۔ چند برس بعد آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی' تو چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ کی جوڑی اس کی روح رواں تھی۔ لیکن جیسے جیسے برصغیر کی سیاست میں پاکستان کا نظریہ ابھرتا گیا' ویسے ویسے ان دونوں لیڈروں کے راستے بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے' چودھری صاحب نے مسلم کانفرنس سمیت قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں نظریہ پاکستان کا راستہ اختیار کر لیا۔ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کا ڈیڑھ اینٹ کا مندر الگ بنا کر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے چرنوں میں جا بیٹھے چودھری غلام عباس کی شخصیت اور سیاست صدق' خلوص' دیانت اور امانت کا مرقع تھی۔ ان کی آنکھوں میں عقاب کی تیز نگاہی تھی' اور دل میں جذبات کی طغیانی۔ اسلام پر ان کا صرف ایمان ہی نہ تھا' بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ بڑے سحر خیز' عبادت گزار اور قلندر صفت مومن تھے۔ اسلام کے بعد ان کا دوسرا جزو ایمان پاکستان تھا۔ مسلمان کشمیر کے دل میں پاکستان کے ساتھ وابستگی کا عقیدہ راسخ کرنے کا سہرا سب سے زیادہ انہی کے سر ہے۔ زندگی عزیز کے کئی سال انہوں نے جیل میں گزارے۔ پاکستان آ کر بھی انہیں دوبارہ جیل جانا پڑا۔ سچی بات دو ٹوک کہہ دینا ان کی طبیعت ثانی تھی۔ اس لیے اپنے بھی ان سے خفا تھے بیگانے بھی ناخوش۔ وہ زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکے قند۔ حال کی حقیقت کو قال کی مصلحتوں میں چھپانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ان کے اصلی جوہر کو اگر کسی نے پہچانا تو صرف قائداعظم نے پہچانا۔ پاکستان کے باقی سب لیڈر اوپر سے تو ان کی عزت کرتے تھے' لیکن اندر سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ چودھری صاحب کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ یہ جنس نایاب ہماری سیاست کے مزاج کی ضد تھی۔ اس لیے ذہنی تصادم کا میدان کارزار ہر وقت گرم رہتا تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ کے کباڑخانے میں بے پیندے کا لوٹا تھے۔ جب انہوں نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے اپنی اڑان شروع کی' اس وقت وہ ایک سکول میں سائنس ٹیچر تھے۔ چہرے پر بڑی خوشنما داڑھی تھی اور گلے میں لحن داؤدی کا نور بھرا تھا۔ ان کی قرات اور نعت خوانی ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو مسحور رکھتی تھی۔ لیکن پھر مسٹر گوپال سوامی آئنگر کشمیر کا وزیراعظم بن کر آیا۔ کہنے کو یہ آئی۔ سی۔ ایس افسر تھا' لیکن درپردہ وہ انڈین نشنل کانگرس کے مندر کا پجاری تھا۔ اس نے اپنے جال کچھ ایسی چابکدستی سے بچھائے' کہ شیخ صاحب سدھائے ہوئے بٹیر کی مانند بڑی آسانی سے تہہ دام آ گئے' دیکھتے ہی دیکھتے۔ ان کی ذہنی' معاشی اور جسمانی کایا کلپ ہو گئی۔ امیر اکدل اور حضرت بل کے جلسوں میں نعتیں پڑھ کر لاکھوں کو رلانے والے شیخ جی اب نئے نئے اپٹوڈیٹ سوٹ پہن کر "بندے ماترم" کا ترانہ الاپنے' بمبئی کے "تاج" اور کلکتہ کے "گرینڈ" ہوٹل کی ہائی سوسائٹی میں چہچہانے لگے۔ ریذیڈنسی روڈ جموں پر انجمن اسلامیہ کے غریبانہ دفتر سے اٹھ کر ان کی نشست و برخاست برلا ہاؤس دہلی' انند بھون الہ آباد اور واردھا جیسے مقامات میں منتقل ہو گئی۔ مسلم کانفرنس سے ناطہ توڑ کر شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی' تو پہلے اس کے استرے سے اپنی خوبصورت داڑھی کا صفایا کیا' اور پھر اس قضیہ کشمیر کی خشت اول بھی رکھ دی جو آج تک پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک خطرناک ناسور کی طرح رس رس کر بہہ رہا ہے شیخ محمد عبداللہ کی یہ ڈگر کسی نظریاتی اصول پرستی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ وہ سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھ کر اسے اپنی طبعی ہٹ دھرمی برخود غلط انانیت اور ذاتی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی کرسی ان کی زندگی کا واحد مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر متمکن رہنے کے لیے وہ سیاسی بلیک میل بھی کرتے تھے' اپنا تھوکا ہوا بھی چاٹتے تھے' اصولوں کی قلابازیاں بھی کھاتے تھے اور مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ منافقانہ آنکھ مچولی بھی کھیلتے تھے۔ ان کے یار غار

For more books visit www.4Urdu.com

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی گیدڑ بھبکیوں کی قلعی کھولنے کے لیے ان کو کئی برس جیل میں ٹھونسے رکھا' اور شیخ صاحب ان کے حضور بدستور وفاداری کی دم ہلاتے رہے۔

URDU4U.COM

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی نے کالی دیوی کا روپ دھار کر آمریت کا ڈول ڈالا' تو وہ بھی اس کے فریم میں کھٹاک سے فٹ ہو گئے۔ مسز اندرا گاندھی کی معزولی کے بعد بھارت میں ہوا کا رخ بدلا' تو شیخ صاحب نے بھی جھٹ پٹ "قسقہ کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا!" چنانچہ جب جموں کے پہاڑ پر ویشنو دیوی کا میلہ منعقد ہوا' تو شیخ محمد عبداللہ نے بھی دیوی کی یاترا کے لیے کمر باندھی' اور آخری تین سو فٹ کا فاصلہ ڈنڈوت کرتے ہوئے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ کر رینگتے ہوئے طے کیا۔ دیوی ماتا کے چرن چھوئے' اور اس کے پاؤں کا دھوون پی کر اپنی وزارت اعلیٰ کو آب حیات کا انجیکشن دیا۔ شیخ صاحب کی سیاست پلاس ٹی سین کی ہم صفت تھی' ان کے بھارتی آقا جب چاہیں انہیں توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا پتلا بنا لیتے تھے۔

مسلم کانفرنس کے ابتدائی دور میں چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ والد صاحب کے پاس بڑی کثرت سے آیا کرتے تھے۔ ریاستی مسلمانوں کی زبوں حالی' ان کے حقوق اور مطالبات کے متعلق کبھی مہاراجہ کو میمورنڈم بھیجنا ہوتا تھا' کبھی وزیراعظم کو' کبھی ریذیڈنٹ کو' علامہ اقبال کو باخبر رکھنے کے لیے ان کے نام بھی طویل مراسلے تیار کئے جاتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کی تحقیقات کے لیے مڈلٹن کمیشن مقرر ہوا' تو اس کے لیے بھی مسلمانوں کا کیس تیار کرنا ہوتا تھا۔ ریاستی مسلمانوں کی شکایات' مشکلات اور حقوق کا تعین کرنے کے لیے گلانسی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا تو اس کو بھی بڑے بڑے میمورنڈم پیش کرنے تھے۔ اس قسم کی سیاسی دستاویزات کی ڈرافٹنگ عبداللہ صاحب کے سپرد ہوتی تھی۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد عبداللہ صاحب آنریری سیکرٹری کے طور پر انجمن اسلامیہ جموں کا کام بھی سنبھالتے تھے' اور صبح سے شام تک ان کے پاس دور دراز سے آئے ہوئے مسلمان کاشت کاروں اور سرکاری ملازموں کا تانتا بندھا رہتا تھا' جنہوں نے اپنی کسی

For more books visit www.4Urdu.com

تکلیف کے سلسلے میں حکومت کے پاس درخواست یا اپیل دائر کرنا ہوتی تھی' عبداللہ صاحب بڑی خندہ پیشانی سے انہیں مشورے بھی دیتے تھے اور ان کی درخواستیں اور اپیلیں بھی ڈرافٹ کر دیتے تھے۔

URDU4U .COM

ان کا طریق کار یہ تھا کہ دن میں وہ اپنا بستر لپیٹ کر گاؤ تکیے کی طرح سرہانے رکھ لیتے تھے' اور بان کی کھری چارپائی پر اس سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتے تھے۔ گرمیوں میں قمیض اتار دیتے تھے' اور صرف شلوار پہن کر بیٹھتے تھے۔ ان کی رومی ٹوپی پاس ہی ایک تپائی پر پڑی رہتی تھی۔ جب کبھی ماں جی کمرے میں داخل ہوتی تھیں' تو وہ فوراً اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لیتے تھے۔ قمیض کے بغیر شلوار اور رومی ٹوپی کا لباس ہمیں عجیب سا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اسی انداز سے بڑے بڑے لیڈروں سے مل لیتے تھے۔ اسی طرح چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھا لیتے تھے' چائے پی لیتے تھے' اور انگریزی زبان میں نہایت اہم سیاسی' آئینی اور قانونی میمورنڈم لکھاتے جاتے تھے۔

جب انہوں نے کچھ لکھانا ہوتا تھا' تو میری طلبی ہوتی تھی۔ میں کاغذ پنسل لے کر پائنتی بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بے تکان بولتے جاتے تھے۔ میں اپنے ہی وضع کردہ شارٹ ہینڈ میں لکھتا جاتا تھا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی نشست میں تیس تیس چالیس چالیس صفحوں کا ڈکٹیشن ہو گیا۔

آئے دن کی یہ ریاضت اپنا رنگ لا کے رہی' اور دل ہی دل میں مجھے اپنی انگریزی دانی پر کافی اعتماد ہو گیا۔ میں تھرڈ ائیر میں پڑھتا تھا' کہ لندن سے ایک بین الاقوامی مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان ہوا۔ سب سے چوری چوری میں نے بھی ایک ساٹھ ستر صفحات کا مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے پہلا انعام مجھے مل گیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ اخبارات میں تصویریں شائع ہوئیں۔ برصغیر کے بہت سے ہندو اور مسلمان مشاہیر کے تہنیتی خط اور تار آئے۔ کالج والوں نے چندہ کر کے میری ایک بڑے سائز کی فوٹو فریم کروائی۔ سارے کالج کا جلسہ منعقد ہوا۔ پرنسپل نے صدارت کی۔ مجھے ان کے ساتھ سٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ چند پروفیسروں نے تعریفی تقریریں کیں۔ اور کافی لمبی چوڑی

For more books visit www.4Urdu.com

رسم کے بعد میری تصویر کالج کے ہال میں ایک نہایت نمایاں جگہ آویزاں کر دی گئی۔ پہلے پہلے تو میں کچھ جھینپتا سا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ انا کی خود پرسی غالب آئی۔ دن میں ایک بار میں ضرور کسی نہ کسی بہانے کالج کے ہال سے گزرتا تھا' اور کن انکھیوں سے جب اپنی تصویر پر نگاہ غلط انداز ڈالتا تھا' تو میرا نفس بے اختیار گول گپے کی طرح پھول جاتا تھا۔

انعام کی مبارکبادی کے دو خط میری جگہ میرے پرنسپل کو آئے۔ ایک حیدر آباد دکن کے وزیراعظم سر اکبر حیدری کے پرائیویٹ سیکرٹری کی جانب سے تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ سر اکبر حیدری خوش ہو کر مجھے ایک سو روپے کی کتابیں انعام میں مرحمت فرمانا چاہتے ہیں۔ پرنسپل صاحب اس قیمت کے اندر اندر کتابوں کی فہرست بنا کر بھیج دیں' اور ساتھ ہی میرے چال چلن اور ریاستی حکومت کے ساتھ وفاداری کی تصدیق بھی کریں۔

پرنسپل سیوارام سوری نے مجھے بلا کر میری پسندیدہ کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ انہوں نے میری نیک چلنی اور وفاداری کے متعلق بھی ایک نہایت اچھا سرٹیفکیٹ بنا رکھا تھا۔ لیکن میں نے یہ انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس میں انعام کی پیشکش کم اور پولیس انکوائری کا رنگ زیادہ جھلکتا تھا۔ پرنسپل صاحب نے مجھے سمجھایا کہ بیوقوف نہ بنو۔ مفت میں کچھ اچھی اچھی کتابیں ہاتھ آ جائیں گی۔ جب میں نہ مانا تو تالیف قلب کے طور پر انہوں نے اپنی جیب سے مجھے پچیس روپے نقد عطا فرمائے' کہ اپنی مرضی کی کتابیں خرید لو۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ تقریباً ڈیڑھ برس بعد جب علامہ اقبال کی زندگی میں پہلا اقبال ڈے منایا گیا' تو مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ چرچا عام ہوا' کہ سر اکبر حیدری نے نظام دکن کے توشہ خانہ سے انہیں ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور "تواضع" ارسال کیا تھا۔ علامہ نے سر اکبر حیدری صدراعظم حیدر آباد دکن کے نام یہ اشعار لکھ کر چیک واپس کر دیا تھا:

For more books visit www.4Urdu.com

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اصل وجہ کا تو اب تک وثوق سے کوئی علم نہیں' لیکن عجب نہیں سر اکبر حیدری نے اپنی عادت کے مطابق علامہ اقبال کے چال چلن اور حکومت وقت کے ساتھ وفاداری کی کوئی تصدیق طلب کی ہو!

پرنسپل کے نام دوسرا خط کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کے اے۔ ڈی۔ سی کی جانب سے تھا۔ اس میں حکم تھا' کہ ازروئے الطاف خسروانہ ہز ہائینس نے مجھے چائے پر مدعو فرمایا ہے۔ پرنسپل کو ہدایت کی جاتی ہے' کہ وہ مجھے "سرکار" کی حضوری کے آداب سمجھا کر مقررہ وقت پر راج محل حاضر ہونے کی تاکید کریں۔

پرنسپل صاحب نے بڑی وضاحت سے مجھے مہاراجہ کی بارگاہ میں حاضری اور گفتگو کے طور طریقے سکھائے' اور جب وہ روز سعید طلوع ہوا' تو میں بڑے اہتمام سے سوٹ بوٹ پہن کر شام کے چار بجے مہاراجہ پیلس پہنچ گیا۔

وہاں پر ایک صاحب نے جو "ڈیوڑھی وزیر" کہلاتے تھے' مجھے از سر نو مہاراجہ کی سرکار میں پیش ہونے کے آداب سمجھائے' اور ایک آراستہ ویٹنگ روم میں بٹھا دیا' جہاں دس بارہ آدمی درباری لباس پہنے چند پری چہروں کے ساتھ پہلے سے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی صبح کے نو بجے سے باریابی کا منتظر بیٹھا ہے' کوئی دس بجے سے۔ لیکن سرکار

For more books visit www.4Urdu.com

نے ابھی تک یاد نہیں فرمایا۔ میں نے ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کچھ بے صبری دکھائی' تو ڈیوڑھی وزیر غصے سے بولے' کہ میاں تم کس کھیت کی مولی ہو۔ یہ دوسرے حضرات جو یہاں بیٹھے ہیں۔ سب کرسی نشین درباری ہیں۔ اور یہ آراستہ پیراستہ خواتین سرکار کی منظور نظر ہیں۔ تین چار دن سے یہ ہو رہا ہے' کہ یہ سب صبح سویرے یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں' اور شام تک انتظار کر کے ہنسی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ تم بھی چپکے سے بیٹھے رہو۔

میں گھنٹہ بھر اور چپکے سے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اپنی خودی کو تھوڑا سا بلند کیا' اور ڈیوڑھی وزیر کو برملا کہہ دیا' کہ مہاراجہ صاحب سے ملنے کی درخواست میں نے نہیں کی۔ انہوں نے خود مجھے چائے پر مدعو کیا ہے۔ اب اگر انہیں فرصت نہیں تو میں چلتا ہوں۔

ڈیوڑھی وزیر صاحب مجبور ہو کر خالص ڈوگری زبان میں بظاہر زیر لب بڑ بڑاتے لیکن حقیقتاً مجھے گالیاں دیتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو اے۔ ڈی۔ سی آئے اور مجھے کشاں کشاں راج محل کے ایک اندرونی برآمدے میں لے گئے۔ وہاں انواع و اقسام کی وردیاں زیب تن کئے بیروں' بٹلروں اور درباریوں کا ہجوم ایک صوفے کے گرد دست بسہ ایستادہ تھا۔ صوفے پر ہزہائینس راج راجیشور مہاراج ادھیراج شری مہاراجہ ہری سنگھ بہادر' اندر مہندر' سپہر سلطنت انگلشیہ' جی۔ سی۔ ایس۔ آئی' جی۔ سی۔ آئی۔ ای' کے۔ سی۔ وی۔ او' نڈھال بھینسے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت پوست صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کر پھٹ گیا ہو۔

مہاراجہ ہری سنگھ رات بھر شراب کے ساتھ کچے اور پکے گوشت کا شغل فرماتے تھے' اور دن بھر وید' حکیم اور ڈاکٹر ان کے کشتوں کے پشتے لگا کر انہیں اگلی شب کے لیے تازہ دم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی چند عورتیں اور مرد ان کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کی خفی اور جلی مالش کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کی آنکھیں کچھ